تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات بالترتیب ۶۴۔ ۹۶۔ ۱۲۸

قیمت اول ۵، دوم ۶، سوم ۳ ر پتہ: عظیم الشان بکڈپو، سلطان گنج، پٹنہ - ۶

یہ تینوں رسالے اردو شعرا کے تذکرے ہیں، ان میں اول الذکر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا ہے، مصحفی نے اردو اور فارسی شعرا کے تین تذکرے لکھے تھے، عقد ثریا اصلا فارسی شعرا کے تراجم پر مشتمل ہے، لیکن اس میں ۵۴ ایسے شعرا کا تذکرہ بھی ہے جو اردو فارسی دونوں میں داد سخن دیتے تھے۔ لائق مرتب نے ان شعرا کے حالات علیحدہ مرتب کرکے مناسب ترمیم واضافہ کے بعد شائع کیے ہیں، دوسرا تذکرہ لچھمی نرائن شفیق کی تصنیف اور اردو کے اہم تذکروں میں ہے، یہ دونوں تذکرے مدت ہوئی بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم کے فاضلانہ مقدموں کے ساتھ چھپے تھے، مگر اب نایاب اور فارسی میں ہونے کی وجہ سے ان کا فائدہ محدود تھا، اس لیے لائق مرتب نے بیجا طوالت، غیر ضروری تکرار اور نمونے کے اشعار وغیرہ حذف کرکے ان کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے، آخری کتابچہ دو تذکروں کا مجموعہ ہے، جو نواب صدیق حسن خاں کے فرزندوں علی حسن خاں اور نور الحسن خاں کی یادگار ہیں، یہ دونوں کمیاب اور فارسی میں تھے، لیکن فائدہ سے خالی نہ تھے، اسلیے جناب عطا کاکوی صاحب نے ان کا ترجمہ وتلخیص بھی شائع کی ہے، چمنستان شعرا کی ابتدا میں لائق مرتب کے قلم سے ایک قابل ذکر مقدمہ ہے، اس میں اردو تذکرہ نگاری کی مختصر تاریخ اور مصنف کے مختصر سوانح وکمالات اور اس تذکرے کی خصوصیات وغیرہ تحریر کی گئی ہیں، ان تذکروں کے ترجمہ وتلخیص کی اشاعت ایک مفید ادبی خدمت ہے۔

"ض"

جلد ۱۱۴ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۴ء عدد ۵

مضامین

ایک ضروری تصحیح:۔ ماہ اکتوبر میں ظفرنامہ اکبری کے صاحب مضمون کا نام مظفر حسین غلط چھپ گیا ہے، صحیح منظر حسین ہے، ناظرین تصحیح فرمالیں "م"

شذرات

قوموں اور ملکوں کی صحیح تعمیر و ترقی کے لیے جس طرح مادی وسائل کی ضرورت ہے، اسی طرح اخلاق و سیرت کردار بھی ضروری ہے، مادی وسائل کی حیثیت اگر جسم کی ہے تو اخلاق و سیرت کی روح کی، جس طرح جسم روح کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح کوئی قوم اخلاق و کردار کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، اور وہ ہمیشہ بدنظمی اور انتشار کا شکار رہے گی، جس کی مثال ایشیا اور افریقہ کے نوآزاد ملک ہیں، ان میں جن ملکوں میں مادی ترقی نظر آتی ہے اس سے بھی وہ پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ آزادی بہت بڑی نعمت ہے، لیکن اسکو قائم رکھنے اور اس کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے کے لئے جنگ آزادی ہی کی طرح ایثار و قربانی اور مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے، فرق یہ ہے کہ آزادی کے لئے جانی و مالی ایثار کی ضرورت ہوتی ہے، اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے اخلاص و ایمانداری کے ساتھ مسلسل جد و جہد جاری، اخلاق اور سیرت و کردار کے بغیر ممکن نہیں ہے، ایشیا اور افریقہ کے نوآزاد ملکوں کی بدبختی یہ ہے کہ آزادی کے بعد انکی اکثریت تعمیر و ترقی کے بجائے مال و دولت اور جاہ و اقتدار کی ہوس میں مبتلا ہو جاتی ہے، سیاسی پارٹیاں، اقتدار کی اور دوسرے طبقے اپنے اپنے دائرے میں دولت سمیٹنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، جس سے ملک کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، آج ان ملکوں میں جو سیاسی انتشار اور اقتصادی بحران بپا ہے وہ سب اسی کا نتیجہ ہے،

اس دور میں ترقی کا معیار، ٹکنالوجی، بڑے بڑے کارخانے دیو ہیکل مشینیں ان کی

مصنوعات اور اسلحہ و سامان جنگ بن گئے ہیں اسلئے ہماری توجہ انہی کی طرف رہتی ہے، اس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں، لیکن قومی ترقی کے دوسرے اہم رکن اخلاق و سیرت کی تعمیر کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر طبقہ خود غرضی اور ذاتی مفاد میں مبتلا ہے، اور مادی ترقی کے باوجود کسی ملک کو بھی سکون و اطمینان میسر نہیں، آئے دن شورش بپا رہتی ہے، تخریبی تحریکیں اٹھتی رہتی ہیں، جس سے پورا ملک انتشار کا شکار ہو جاتا ہے جس سے مشکل ہی سے کوئی ملک مستثنیٰ نکل سکتا ہے، ان حالات میں اگر حکومت کوئی اصلاحی قدم اٹھاتی بھی ہے تو خود غرض عمال اس کو کامیاب نہیں ہونے دیتے، اگر مادی ترقی کی طرح اخلاق و کردار کی تعمیر کی طرف بھی توجہ ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی، اسی لیے گاندھی جی نے سیاست اور اخلاق و سیرت کو ساتھ ساتھ رکھا تھا، ان کی سیاست کی بنیاد ہی اخلاق پر تھی، اور وہ عمر بھر اس کا عملی سبق دیتے رہے، اور آج بھی ملک بلکہ انسانیت کی فلاح اسی پر موقوف ہے،

جو ملک خالص مادہ پرست اور اخلاق و روحانیت سے تہی دامن سمجھے جاتے ہیں اور جن کا نصب العین صرف مادی ترقی ہے، ان کا بھی ایک قومی کردار ہے، جو اس کی طبیعت ثانیہ بن گیا ہے، اور جس کے وہ سختی سے پابند ہیں، ان کے اور عیب جو بھی ہوں لیکن انکا ہر فرد اپنے ملک کا بہی خواہ ہے، ذاتی مفاد پر اجتماعی اور ملکی مفاد کو ترجیح دیتا ہے جب ملک پر کوئی مشکل وقت آتا ہے تو ہر طبقہ اپنے اپنے دائرے کے اندر اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جان و مال کسی چیز سے بھی دریغ نہیں کرتا، اسکے برعکس ایشیائی ملکوں کے باشندے ایسے اوقات میں مدد کرنے کے بجائے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ملک کی مشکلات میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، جس کا تجربہ ہر شخص کو ہے،

دوسرے ملکوں سے ہمکو بحث نہیں، ہندوستان ایک مذہبی ملک ہے اس نے دوسری قوموں

کو اخلاق اور روحانیت کا سبق دیا ہے، آج اس کا بڑا حصہ قومی اخلاق اور کردار سے بھی محروم ہے، جو گنے چنے ملک کے سچے ہوا خواہ رہ گئے ہیں، ان کی کوئی آواز نہیں اور نہ ان میں ان حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت ہے، اس کی صرف ایک ہی شکل ہے کہ ایسے لوگ حکومت اور عہدوں کو چھوڑ کر جس طرح آزادی کی جنگ لڑے تھے اسی طرح حکومت کی مدد سے خود غرضی اور بد دیانتی کے خلاف جنگ کریں اس کے علاوہ موجودہ حالات کی اصلاح کی اور کوئی شکل نہیں ہے،

یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ سرمایہ دار اور کمیونسٹ ملک جو ایک دوسرے کے بالکل ضد ہیں آپس میں مل سکتے ہیں، چین اور روس سے امریکہ کی مفاہمت ہو سکتی ہے، لیکن دو اسلامی ملک جن میں اسلامی اخوت کا قوی رشتہ ہے نہیں مل سکتے اصل میں چھوٹے ملکوں کے جنگ و امن کا دار و مدار بھی بڑی قوتوں پر ہے، اگر وہ ان کے معاملات میں بالکل غیر جانبدار ہو جائیں اور کسی کی حمایت و سرپرستی نہ کریں تو بڑی حد تک ان کے اختلافات ختم ہو جائیں گے، یا کم سے کم اس کا کوئی خطرناک نتیجہ نہ نکلے گا، اس لئے کہ ان میں بڑی طاقتوں کی مدد بغیر اپنے بل بوتے پر لڑنے کی طاقت نہیں ہے، لیکن وہ اپنے مصالح کی بنا پر اس کھیل سے دست بردار نہیں ہو سکتیں، اس لئے چھوٹے ملکوں کی دانشمندی اسی میں ہے کہ وہ ان کا آلۂ کار نہ بنیں! جنگ سے فائدہ سے کہیں زیادہ نقصان پہنچے گا، اور ان کی ترقی کیا آزادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی،

مقالات

حدیث کا درایتی معیار

(داخلی نقد حدیث)

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی، ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۷)

مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ دور کرنے کا طریقہ

داخلی وخارجی نقد کا ٹکراؤ اگر مستند کتب حدیث کی روایت میں ہے اور خارجی نقد کے لحاظ سے وہ صحیح ہے تو پہلے کلام نبوت کی حیثیت سے اس کا محل متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی، اگر اس سے ٹکراؤ دور نہ ہو تو پھر داخلی نقد کو بنیاد بنا کر اس کے صحیح وغیر صحیح ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، اس کے دلائل یہ ہیں:-

داخلی نقد کی فوقیت کے دلائل

(۱) قرآن حکیم میں ہے،

وَاِذَا جَاءَ هُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ [۱]

جب اُن کے پاس امن یا ڈر کی کوئی خبر آتی ہے تو اُس کو مشہور کر دیتے ہیں، اگر اس کو رسولؐ اور اولوالامر تک پہنچا دیتے تو جو اُن میں ملکۂ استنباط رکھنے والے ہیں وہ اس کو پوری طرح

---

[۱] نساء - ۱۱

اس آیت میں خبر کی حیثیت متعین کرنے کی جس انداز میں تاکید ہے، اس سے ظاہر ہے کہ صرف راوی کی ثقاہت ہر خبر پر اعتماد کے لئے کافی نہیں ہے، پھر جس خبر سے شانِ نبوتؐ پر حرف آئے یا معیارِ نبوت برقرار نہ رہ سکے، اس میں راوی کی ثقاہت کو بدرجۂ اولیٰ ثانوی قرار دے کر اصل زور نفس خبر (داخلی نقد) پر ہوگا جس کو بنیاد بنا کر فیصلہ کیا جائے گا،

۲- اس صورت میں داخلی نقد کو بنیاد بنانے کی ایک بڑی وجہ اس کا تقدم ہے کیونکہ علوم حدیث میں سب سے پہلے داخلی نقد کا وجود ہوا جیسا کہ دورِ صحابہؓ کی بعض مثالیں گزر چکی ہیں، خارجی نقد کا وجود بہت بعد میں ہوا، اب اگر صرف خارجی کو قابلِ اعتماد ٹھہرانے سے "حدیث" پر زد پڑتی ہے، تو لا محالہ داخلی کو فوقیت حاصل ہوگی،

۳- محدثین کی درج ذیل صراحت سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے،

کل ما خالف الادلة القاطعة	ظنی حدیث کے متن یا معنی میں جو چیز
العلمیة من الاحادیث	بھی علمی قطعی دلائل کے خلاف ہو تو
الظنیة فی متنها او معناها	بالاتفاق قطعی پر عمل واجب ہے
وجب العمل بالقطعی	ظنی پر نہیں،
دون الظنی اجماعاً[1]	

اسی بنا پر کہا گیا ہے:۔

هذه مزیة حسنة وانها	یہ عمدہ فضیلت اور ان لوگوں پر
لابلغ رد علی اولئك الذین	بہترین رد ہے، جو کہتے ہیں کہ

۱ محمد بن ابراہیم الوزیر الیمانی - الروض الباسم فی الذب عن سنة ابی القاسم کل ما خالف الادلة الخ

یدعون علماء الحدیث	علمائے حدیث کو متن کے نقد کی
لم یعرفوا نقد المتن ابداً[1]	معرفت نہیں حاصل ہے،

(۴) قاضی حسن بن عبدالرحمٰن الرامہرمزی (۲۶۵-۳۶۰) کی کتاب المحدث الفاصل بین الراوی والواعی عام خیال کے مطابق اصولِ حدیث کی سب سے پہلی کتاب ہے، اس میں ابو عباس حرانی کے حوالہ سے ابو عاصم نبیل کا یہ قول منقول ہے،

الرياسة فی الحدیث بلا	درایت کے بغیر حدیث میں سرداری
درایة ریاسة نذلة[2]	ایک ادنیٰ قسم کی سرداری ہے،

اسی کتاب میں ایک مستقل باب "القول فی فضل من جمع بین الروایة والدرایة" ہے، جس میں کئی ایسی روایتیں نقل کی گئی ہیں جو روایت و درایت کو جمع کرنے کی ضرورت اور اس کی فضیلت بڑی کو ظاہر کرتی ہیں،[3]

"داخلی نقد" کی اس اہمیت کے باوجود ہر موقع پر صرف "خارجی" کو بنیاد بنانا اور بات بنانے کے لئے حدیث کی ناقابلِ قبول تاویل سے بھی دریغ نہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے "جواہرات" کے ڈھیر میں اگرچہ خزف ریزوں کی آمیزش ہو، تو ڈھیر کی عظمت اس میں ہے کہ اُن کو خزف ریزہ تسلیم کیا جائے نہ کہ دور از کار تاویل کے ذریعہ اُن کو "جواہرات" ثابت کیا جائے، اس سے "خزف ریزے" تو جواہرات میں تبدیل نہ ہو سکیں گے، البتہ انکی وجہ سے "جواہرات" کی قدر و قیمت یقیناً گھٹ جائیگی،

حق و انصاف کی بات

(۵) حق و انصاف کی بات یہ ہے کہ مستند کتبِ حدیث کی کوئی روایت کتنے

۱ محمد صباغ: مقدمہ الاسرار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة (موضوعاتِ کبیر کا اصل نام یہی ہے جو محمد صباغ کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے)۔ ۲ قاضی حسن بن عبدالرحمٰن الرامہرمزی: المحدث الفاصل بین الراوی والواعی: القول فی فضل من جمع بین الروایة والدرایة،

۳ ایضاً

ثقہ راویوں سے مزین ہو اگر وہ علمی قطعی دلائل سے ٹکرائے گی، یا اس سے شانِ نبوت پر حرف آئیگا تو وہ ہرگز قابلِ قبول نہ ہوگی، "معیارِ نبوت" گرانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ راویوں کی ثقاہت مجروح قرار دی جائے، خصوصاً جب کہ اس امر کا امکان موجود ہے کہ کسی بددین و جھوٹے راوی نے موضوع روایت کو ثقہ راویوں کی حدیث میں داخل کر دیا ہو، اور یہ داخل شدہ روایت ثقہ راوی کی حدیث سمجھ کر روایت کی گئی ہو، یا درمیان سے جھوٹے اور ضعیف راویوں کو نکال کر براہِ راست شیخ سے روایت کی گئی ہو، جیسا کہ ابن جوزی نے ثقہ راویوں کی موجودگی میں حدیث کے موضوع یا مقلوب ہونے کی دو شکلیں پیش کی ہیں، اور اُن کی معرفت کو حد درجہ مشکل قرار دیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں:-

فان قوی نظرک ورسخت	اگر تیری نظر قوی ہے، اور اس علم
فی ھذا العلم فھمت مثل	میں رسوخ حاصل ہے، تو اس جیسی
ھذا وان ضعف فسئل	صورت کو سمجھے گا، اور اگر کمزور ہے
عنہ وان کان قد قل من	تو اس کے بارے میں پوچھ لے اگرچہ
من یفھم ھذا بل قد عدم[۵]	اُس کے سمجھنے والے بہت کم بلکہ نہ ہونے
	کے برابر ہیں،

شعورِ نبوت کی خصوصیات: داخلی نقد و تحقیق کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ حدیث کا ماخذ (سرچشمہ) شعورِ نبوت ہے، اس کو جو خصوصیات حاصل ہیں، وہ کسی اور کے "شعور" کو نہیں حاصل ہیں، مثلاً

(۱) نور میں اُس کی پرورش ہوتی اور نورانی تجلیاں اس کے جلو میں رہتی ہیں:-

[۵] ابن جوزی۔ کتاب الموضوعات، الباب الثالث:

(۲) قوتِ قدسیہ اور تجلیاتی شعور سے ہر وقت متصف رہتا ہے،

(ا) قوتِ قدسیہ۔ خواہشاتِ نفس سے حفاظت کی بنا پر جو شعور کی بیداری اور روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے،

(ب) تجلیاتی شعور۔ مشاہدۂ حق سے جو نور کی شعاع باطن پر پڑتی اور باطن کے خواص و اسرار کو روشن کر دیتی ہے،

(۳) زندگی کے راز سے واقف کرانا اور "سپرچل کانسٹی ٹیوشن" کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھاتا ہے،

(۴) عالمِ غیب سے تعلق رکھتا ہے جو غیر متناہی علوم کا خزانہ اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہے،

(۵) غلطی اور سرکشی سے اُس کی حفاظت ہوتی رہتی ہے، وغیرہ،

ان خصوصیات کی طرف درجۂ ذیل آیات میں اشارہ ہے،

قل ما کنت بدعا من الرسل	آپ کہدیجئے کہ میں کوئی نیا رسول
وما ادری ما یفعل بی و	نہیں ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ (کل)
لا بکم ان اتبع الا ما یوحی	میرے اور تمھارے ساتھ کیا کیا معاملہ
الیّ[۱]	کیا جائے گا، میں تو اس کا اتباع
	کرتا ہوں جس کی وحی میرے پاس
	آتی ہے،
فاقم وجھک للدین حنیفا	آپ اپنے رُخ کو اس دین کی طرف

[۱] الاحقاف، رکوع ۲۔

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ ذٰلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لایعلمون[1]

کر لیجئے، جس میں کجی کا نام نہیں، اللہ کی وہ فطرت جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کی پیدایش میں کوئی تبدیلی نہیں ہے، یہ دین قیم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں،

ذٰلک من انباء الغیب نوحیہ الیک[2]

یہ غیب کی خبریں ہیں، جن کی ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں،

فلا یظھر علٰی غیبہ احداً الا من ارتضٰی من رسول[3]

اللہ تعالیٰ غیب کو اپنے برگزیدہ پیغمبر کے سوا اور کسی کے اوپر نہیں ظاہر کرتا،

ماکذب الفؤاد ما رأی[4]

قلب نے اس میں کوئی غلطی نہیں کی جو اُس نے دیکھا،

مازاغ البصر وما طغٰی[5]

نہ نگاہ نے کجی اختیار کی، اور اور نہ سرکشی کی،

ولئن اتبعت اھوآءھم من بعد ما جآءک من العلم انک اذًا لمن الظٰلمین[6]

اگر آپ اُن کی خواہشات کی پیروی کریں گے، بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم و یقین کی روشنی آچکی ہے تو آپ اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں میں میں ہوں گے،

---

[1] الروم رکوع ۴ - [2] آل عمران رکوع ۵ - [3] جن - ۲ - [4] نجم ع ۲ [5] ایضاً
[6] بقرہ رکوع ۱۵

شعور نبوت کے ادراک مشاہدہ میں کوئی شریک نہیں ہے

مذکورہ خصوصیات کی بنا پر شعور نبوت کے ادراک و مشاہدہ میں کوئی اور تو کیا شریک ہوتا، اولیا بھی شریک نہیں ہیں، ابن تیمیہ کہتے ہیں:-

ولا یتصور ان الولی یعطی ما اعطیہ النبی من المشاھدۃ والمخاطبۃ[1]

اس بات کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ جس مخاطبت اور مشاہدہ سے انبیاء علیہم السلام سرفراز کئے جاتے ہیں، اولیا بھی سرفراز کئے جاتے ہیں:

اس ادراک و مشاہدہ کی رسائی ماورائے عقل تک ہے

یہ ادراک و مشاہدہ عقل تک محدود نہیں، بلکہ اس کی رسائی ماورائے عقل تک ہے،

ابن خلدون کہتے ہیں:-

"شارع کے بتائے ہوئے اعتقادات اور اعمال کا اتباع کرو، کیونکہ وہ تم سے زیادہ تمہارے ہی خواہ اور تمہارے فائدہ کی چیزوں کو جاننے والے ہیں کیونکہ اُن کا علم تمہارے ادراک سے بالا اور ایسے ذریعہ سے حاصل ہونے والا ہے، جو تمہاری عقل کے دائرہ سے وسیع تر ہے، یہ چیز عقل اور اس کے ادراک کے منافی نہیں ہے، بلکہ عقل ہی میزان صحیح ہے، اُس کے احکام (بڑی حد تک) یقینی اور جھوٹ سے پاک ہوتے ہیں، لیکن یہ میزان ایسی نہیں ہے جس سے توحید اور آخرت کے اُمور اور نبوت و صفات الٰہیہ کے حقائق کا وزن کر سکو، یہ ایک محال طمع ہے، کیونکہ یہ چیزیں عقل کے طریق اور ادراک سے ماوراء ہیں،[2]

---

[1] ابن تیمیہ، شرح العقیدۃ الاصفہانیہ مطبوعہ کردستان العلمیۃ ص ۱۰۷، [2] ابن خلدون

عقل کی محدودیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

"اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص سونا چاندی تولنے کے کانٹے (ترازو) سے پہاڑ تولنے کا ارادہ کرے، (اور جب وہ ایسا نہ کرسکے) تو یہ نہ کہا جائے گا کہ کانٹا (ترازو) وزن بتانے میں ناقص ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ہر ترازو کی ایک حد ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دے سکتی، اسی طرح میزان عقل کی بھی ایک حد ہے۔ جہاں وہ ٹھہر جاتی ہے، اس سے آگے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا احاطہ نہیں کرسکتی، کیونکہ عقل بھی وجود کے ان ذرات میں سے ایک ذرہ ہے، جو اللہ کی طرف سے حاصل ہوتا ہے، اس سے تم ان لوگوں کی غلطی اور کم فہمی معلوم کرسکتے ہو۔ جو عقل کو اس قسم کے معاملات میں نقل پر ترجیح دیتے ہیں"[1]

امام غزالیؒ کا ارشاد ہے :۔

"عقل سے ماوراء ایک راستہ ہے جس میں دوسری (باطنی) آنکھ کھلتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ غیب کی باتیں اور مستقبل کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان امور کا انکشاف ہوتا ہے، جن میں عقل کام نہیں دے سکتی ... ... جن بعض عقلاء نے اس راستہ کا انکار کیا ہے، ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان کا یہ انکار

(بقیہ حاشیہ علا) :۔

مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ص ۳۸۸،

[1] ابن خلدون ۔ مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ص ۳۸۴،

محض جہالت کی وجہ سے ہے"[1]

شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) فرماتے ہیں :۔

"جس طرح عقل کا راستہ حواس کے راستہ سے ماوراء ہے کہ جو چیز حواس کے ذریعہ نہ جانی جا سکے اس کو عقل معلوم کر لیتی ہے، اسی طرح نبوت کا راستہ عقل کے راستہ سے ماوراء ہے، جو بات عقل سے نہ معلوم ہو سکے وہ نبوت کے ذریعہ معلوم ہو جاتی ہے، جو شخص عقل کے ماوراء کوئی ذریعہ علم نہیں تسلیم کرتا، وہ دراصل نبوت کا منکر اور بداہت سے ٹکرانے والا ہے"[2]

نقد و تحقیق میں افراط و تفریط کے دو گروہ

شعور نبوت کا یہ ادراک و مشاہدہ تسلیم کرنے کے بعد اس سے نکلی ہوئی بات (حدیث) عام لوگوں سے ممتاز اور اس کی نقد و تحقیق کا پیمانہ دوسروں کے "پیمانہ" سے یقیناً مختلف ہوگا، ورنہ نبی اور غیر نبی کے کلام میں فرق و امتیاز نہ قائم رہ سکے گا،

لیکن بدقسمتی سے حدیث کی نقد و تحقیق میں بھی افراط و تفریط نے دو گروہ پیدا کر دیے جنھوں نے نبوت کی قدر و منزلت نہیں پہچانی۔

(۱) ایک گروہ نے کلام نبوت (حدیث) کو جانچنے کے لیے اسی "پیمانہ" سے کام لیا جو عام لوگوں کے کلام کو جانچنے کے لیے مقرر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ہر ایسی حدیث سے انکار کر دیا جس میں کوئی علمی حقیقت بیان ہوئی تھی، اور رسول اللہ کے زمانہ میں وہ مشہور نہ تھی، یا کوئی خوشخبری و مستقبل سے متعلق تھی جس کا ابھی وقت نہ آیا تھا، یا قانونی کلیہ

[1] غزالی ۔ المنقذ من الضلال القول فی خواص النبوۃ، [2] شیخ احمد سرہندی، مکتوبات مجدد ج ۳

حکمت کا اصول بیان ہوا تھا جو اس وقت کی ذہنی سطح سے بلند تھا، اگرچہ بعد میں اس کا رواج ہوگیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب وحی تھے، اسرار غیب سے بھی ایک حد تک واقف تھے، علم وحکمت کی ترویج اور قانون وشریعت کا نفاذ آپ کا خاص مشن تھا، اس لیے اگر آپ نے کوئی بات وقت کی ذہنی سطح سے بلند کہی یا قانون واصول اسی انداز سے بیان کیے جو بعد میں فلسفہ یا قانونی کلیہ کے مشابہ قرار پائے تو اس سے نہ شان نبوت پر حرف آتا ہے اور نہ کسی مقنن وفلسفی سے متاثر ہونے کا سوال اٹھتا ہے،

(۲) دوسرے گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب جو بات بھی دیکھی اس کو "حدیث" قرار دینے میں دین ومذہب کی سب سے بڑی خدمت سمجھ لیا خواہ اس کی خاطر کتنی ہی دور دراز تاویل کرنی پڑے اور معیار نبوت گر کر کہیں سے کہیں پہنچ جائے، ابن جوزی نے اس گروہ کا ماتم ان الفاظ میں کیا ہے،

فکم قد افسد القصاص من	واعظوں نے موضوع حدیثوں کے
الخلق بالاحادیث الموضوعۃ	ذریعہ مخلوق کو کس قدر خراب کیا، کتنے
کم لون قد اصفر بالجوع وکم	چہرے بھوک کی وجہ سے زرد ہوئے،
ھائم علی وجھہ بالسیاحۃ	کتنے لوگ سفر میں بھٹکتے پھرے، کتنوں نے
وکم مانع لنفسہ ما قد ابیح	ان چیزوں سے اپنے نفس کو روک لیا،
وکم تارک روایۃ العلم زعما	جو ان کے لیے مباح تھیں، کتنوں نے علم
منہ مخالفۃ النفس فی ھواھا	کی روایت محض اس بنا پر ترک کردی کہ
فی ذالک وکم موتم اولادہ	اس میں خواہش نفس کی مخالفت نظر
بالتزھد وھو حی وکم معرض	آئی کتنوں نے مصنوعی زہد اختیار کرکے

عن زوجتہ لا یوفیھا حقھا	زندگی ہی میں اپنی اولاد کو یتیم بنا دیا
فھی لا ایم ولا ذات بعل[1]	اور اپنی بیوی کے حقوق کو نظر انداز کرکے
	اس کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا کہ نہ اسکا
	کوئی شوہر ہے اور نہ وہ بے شوہر ہیں،

عدل واعتدال کی راہ

عدل واعتدال کی راہ یہ ہے کہ مقام نبوت تسلیم کرنے کے بعد حدیثوں کے پرکھنے کے اصول وضوابط پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے، اگر اس کے بعد بھی حدیث کی معرفت میں واقعی دشواری قائم رہے تو فقہ کی طرح حدیث میں بھی اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اور ماہرین حدیث کو مزید اصول وضوابط وضع کرنے اور ان کے ذریعہ حدیث کی معرفت حاصل کرنے کا حق ہے،

ان باب الاجتھاد لم یقفل	اجتہاد کا دروازہ فقہ کی طرح حدیث
فی الحدیث کما لم یقفل فی	میں بند نہیں ہوا، ان دونوں علم
الفقہ ویجب ان یظل بابہ	میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہنا
مفتوحا فی کل من ھذین	ضروری ہے،
العلمین[2]	

اب تک اس سلسلہ کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی گئی یا اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، مصر کے مشہور مصنف "احمد امین" نے چند اصول وضع کیے ہیں، مثلاً

(۱) رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث ان ظروف کے مطابق نہ ہو جس میں وہ کہی گئی ہو

[1] ابن جوزی کتاب الموضوعات فصل وقد کان قدماء العلماء الخ [2] ڈاکٹر صبحی الصالح: علوم الحدیث ومصطلحہ، روایۃ الاحادیث الضعیفۃ والعمل بہا۔

(۲) تاریخی واقعات اس کے خلاف ہوں۔

(۳) حدیث کی عبارت فلسفیانہ تعبیر سے ملتی جلتی ہو جو رسول اللہ صلعم کی پسندیدہ تعبیر کے خلاف ہے۔

(۴) حدیث اپنی شرطوں اور قیدوں میں فقہ کے متن کے مشابہ ہو،[1]

(۵) حدیث واقع کے مطابق نہ ہو،

(۶) حدیث وضع کرنے کا کوئی سیاسی محرک ہو،

(۷) حدیث وضع کرنے کا کوئی نفسی محرک ہو،

(۸) حدیث اس ماحول کے مطابق نہ ہو جس میں کہی گئی ہے۔[2]

ان اصولوں کے بارے میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ ماہرین حدیث نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، حالانکہ اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں ہو کہ داخلی نقد حدیث کے جو اصول اوپر ذکر کیے گئے ہیں یہ سب ان میں داخل ہیں، مثلاً نمبر ۱، ۲، و (۱۵) کے تحت ہیں جس میں تاریخی حقائق کی خلاف ورزی کا ذکر ہے، ۳/۴ (۱) کے تحت ہے جس میں رکاکت کی تفصیل ہے، نمبر ۴، ۶ و ۸ (۲۵) کے تحت ہیں جس میں ہر قسم کی عصبیتوں کا ذکر ہے نمبر ۵ (۱۶) کے تحت ہے، جس میں خلاف شواہد موجود ہونے کا ذکر ہے، غرض مقام نبوت تسلیم کرنے کے بعد حدیث کی معرفت کے لیے جس نئے اصول کی بھی ضرورت ہو اسکو خوش آمدید کہنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے، اسی طرح جن حدیثوں پر گفتگو ہو چکی ہے ان پر اگر مزید گفتگو کی ضرورت سمجھی جائے تو اس سے انکار نہ ہونا چاہیے، اہل علم کی مساعی انتہائی قابل قدر ہونے کے باوجود نہ آخری ہیں اور نہ بذریعہ وحی ان کی تصدیق ہوئی ہے۔

---

[1] احمد امین: فجر الاسلام۔ الفصل الثانی الحدیث [2] احمد امین۔ ضحی الاسلام۔ الفصل الرابع الحدیث والتفسیر۔

اندلسی شاعری میں جدید اصناف

از جناب شفیق احمد صاحب ندوی ایم اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اندلسی شاعری کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کے بعد[1] یہ حقیقت سامنے آچکی ہے کہ اغراض و مقاصد کے لیے وہ ایک زمانہ تک قدیم روایتی انداز پر شاعری کرتے رہے، جس میں کوئی جدت وجودت نہ تھی، بعد میں اندلسی عوام اور مغربی ماحول سے متاثر ہو کر انھوں نے دو مستقل نئی اصناف سخن ایجاد کیں جنھیں زجل اور موشحہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، زجل اور موشحہ میں نیچرل شاعری اور ذوق جمال کی تسکین کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

"زجل" — اندلسی لوک گیت کی مخصوص ہیئت زجل اندلس کی عربی شاعری کی نئی ہیئت ہے جو مسلم اسپین نے اندلسی عوام کے جذبات و احساسات کی رعایت سے ایجاد کی، اس کو ایک طرح سے اندلس کے لوک گیت کی نئی ترقی یافتہ شکل کہہ سکتے ہیں،

زجل کے لغوی معنی ہیں "التطریب ورفع الصوت" (بلند آواز سے گیت گانا) اصطلاح میں جیسا کہ عرض کیا گیا اندلسی لوک گیت (Folk Song) کو اس لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، موشحہ کے بعد زجل کی ایجاد عوامی شاعری سے شروع ہوئی، موشحات اور ازجال دونوں اندلسی ہی کی دین ہیں، بے تکلف عامی زبان میں تکلف، صنعت اور فصاحت کا لحاظ رکھے بغیر خوشی اور غمی کے جذبات کے اظہار کے لیے اس کی ایجاد ہوئی، اور مسلم اسپین کے

---

[1] معارف اگست ۱۹۷۴ء

کے آخری دور میں نہایت مقبول رہی، بعض اہل نظر کا کہنا ہے کہ "اندلس کے فطری ماحول نے شعری احساسات کی ترجمانی اور گانے بجانے کی ضرورت نے لوگوں کو موشحات کی طرف مائل کیا جو بعد میں ادبی انحطاط اور عربوں کے اضمحلال و پژمردگی کے باعث عوامی لب و لہجہ اور لوک گیت سے متاثر ہو کر ایک مستقل صنف سخن بن گیا جو زجل کے نام سے موسوم ہوا"[1]

پہلے تو ازجال رواج صرف عوام میں رہا، پھر عوامی مقبولیت اور مغربی اثر نے خواص میں بھی اس کی پذیرائی ہوئی اور ایک زمانہ ایسا آگیا کہ اندلس میں عوام سے لیکر خواص تک سب کے جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ و وسیلہ بن گئی۔

زجل کا موجد راشد نامی ایک شخص بتایا جاتا ہے لیکن معمار زجل اور امام الزجالین کی حیثیت سے ابو بکر بن قزمان کا نام مشہور ہے۔ زجل گو شعراء میں مخلف الاسود، ابن جحدر، سہل بن مالک اور ابن الخطیب زیادہ نامور ہیں۔ ایک خاتون حلبہ مدلیس کا نام بھی زجل گو شعراء میں مشہور ہے۔

عربی زبان کی تمام بحروں سے اس کی بحر یکسر مختلف ہے، یہ عربی اور اسپینی بحروں کا ایک عجیب امتزاج ہے۔ قوافی کا البتہ بہت خیال رکھا جاتا ہے، ابن قزمان ایک مرتبہ کسی پارک میں ٹہلنے گیا، وہاں انگور کی بیلوں سے لدی ہوئی ایک جھونپڑی سے اس کی نگاہ پارک کے سنگ مرمر کے ایک خوبصورت اسٹیچو پر پڑی جس کی شکل شیر کی تھی، اس کے منہ سے صاف شفاف پانی کا فوارہ نکل رہا تھا، اسے دیکھ کر اس کے شاعرانہ احساسات جاگ اٹھے اور بے اختیار ایک زجل وجود میں آگئی، جس کے چند اشعار یوں ہیں:

وعریش قام علی دکان   بحال رواق

---

[1] احمد حسن الزیات کی تاریخ ادب عربی (مفہوم)

واسد قد ابتلع ثعبان   فیہ غلظ ساق

وفتح فمہ بحال انسان   فیہ الفواق[1]

(یعنی انگور کے بیلوں سے لدی ہوئی جھونپڑی چبوترہ کے اوپر کس شاندار ادا سے ہے کہ ایک قوی ہیکل شیر کا مجسمہ ہے جو فوارہ کے بجائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سانپ کو نگل رہا ہے، انسان کی طرح منہ کھولے ہوئے ہے، اسمیں ہچکیاں بھی ہیں تو)

نئی بحر اور قوافی کے اہتمام کے ساتھ ساتھ شعر الطبیعہ کے عناصر حسن کے نمایاں اوصاف مناظر فطرت اور مظاہر جمال کی توصیف ہے، ان زجلیہ اشعار میں بھی بخوبی نمایاں ہیں۔

موشحات (حقیقت و ماہیت) توشیح اندلسی شاعری کی نمایاں صنعت ہے اور نیچرل شاعری (Poetry of Nature) اندلسی شاعری کی جان ہے، جو سب سے بہتر انداز میں موشحات کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

موشحہ خاص اندلس کی ایجاد ہے، جو غنا اور موسیقی کے عوامی ماحول کے اثر سے نویں صدی عیسوی کے اواخر میں مستقل صنعت بن کر نمودار ہوئی، اس صنعت میں مختلف قوافی ایک خاص ترتیب کے ساتھ بار بار آتے ہیں، کبھی کبھی اس کا وزن بھی عام روایتی اوزان سے مختلف ہوتا ہے، اس کے بعض اجزاء میں عجمی اور عوامی زبان کا استعمال لازمی طور پر ہوتا ہے، غنا سے اس کا خصوصی تعلق ہے، موشحات کے میدان میں اہل مغرب (مسلم اسپین) کی اولیت اور اولویت مسلم ہے، مشرق نے فن توشیح میں انکی تقلید کی، موشحہ کا لفظ وشاح سے ماخوذ ہے، وشاح چمڑے کے اس تسمے کو کہتے ہیں جو

---

[1] عبد المنعم خفاجہ: قصۃ الادب فی الاندلس ص ۱۲۳ (ملخصاً)

جواہرات سے مرصع ہو، عرب کی عورتیں پرانے زمانے میں اس کو گلوبند کے طور پر پہنتی تھیں، مراد یہ ہے کہ موشحہ الفاظ، قوافی اور مختلف اجزا سے مزین و مرصع ایک ایسی چیز ہے جس سے ادب کے ذوق جمال کی تسکین کا سامان فراہم ہوتا ہے، جس طرح عورتوں کو مرصع زیورات سے آسودگی جمال کا سامان فراہم ہوتا تھا،

موشحہ کی اصل عربی ہے یا عجمی؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے، ہمیں اس سے زیادہ سروکار نہیں، البتہ اتنی بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ موشحہ عربی مسمط اور عجمی غنائیت کا حسین امتزاج ہے، موشحہ کے آخری جز (خرجہ) کے تمام تر عجمی اور عامی بول چال پر مبنی ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عجمیت کی گرفت اس صنف سخن پر نہایت مضبوط ہے،

عموماً موشحہ کا موجد قبرہ کا ایک نابینا شاعر محمد بن حمود قبری بتایا جاتا ہے، بعض لوگ مقدم بن معافی قبری کا نام موجد موشحات کی حیثیت سے لیتے ہیں، جو امیر عبداللہ مروانی کے شعراء میں تھا، مگر اتنی بات مسلم ہے کہ نویں صدی عیسوی میں اس فن کی بنیاد پڑ گئی تھی، شروع شروع میں اس کی حیثیت محض سماعی تھی، تفریح طبع کے لیے لوگ کہتے اور آپس میں سنکر محظوظ ہوا کرتے تھے، شاید اس کی حیثیت اس زمانہ میں وہی تھی جو آجکل اردو میں ہزل گوئی کی ہے،

ایک قرطبی شاعر یوسف بن ہارون الرمادی نے اس فن کی طرف باقاعدہ توجہ کی اور پھر یہ فن ترقی کرتا ہوا عبادہ بن ماء السماء کے ہاتھوں بام عروج پر پہنچا، جو مروانی خلافت کے آخری دور کا شاعر تھا، مرابطین کے عہد (۱۰۹۵-۱۱۴۹ئہ) میں بلند پایہ شعراء نے بھی موشحات لکھنے شروع کیے، جن میں ایک نابینا شاعر ابو العباس الاعمی التطیلی کا نام سر فہرست ہے، ابن بقی اس کا معاصر تھا، ان

دونوں میں چشمک رہا کرتی تھی، دوسرے موشحہ نگاروں میں ابن باجہ، ابن قزمان ابوجعفر بن سعید، ابن حزمون، ابن زہر، ابن عربی اور ابن سہل کے نام مشہور ہیں، ابن سہل کے موشحے اپنی لطافت اور شگفتگی میں بے مثال ہیں، ابن الخطیب کا موشحہ اندلس کے اجڑے دیار کے مرثیہ کی حیثیت سے نہایت مقبول ہے جس کا مطلع یہ ہے:

جادك الغيث اذا الغيث همى　　يا زمان الوصل بالاندلس

لم يكن وصلك الا حلما　　فى الكرى او خلسة المختلس

دور جدید کے مشہور شاعر احمد شوقی نے بھی ایک موشحہ "صقر قریش" اسی نہج پر لکھا،

عہد موحدین (۱۱۴۹ئہ - ۱۲۴۸ئہ) کے خاتمہ کے بعد فن توشیح بھی اندلس میں آخری ہچکیاں لینے لگا، لوگ موشحہ کے بجائے زجل کی طرف مائل ہو رہے تھے، اور ابن خطیب کی کوششوں کے باوجود زوال غرناطہ کے ساتھ فن توشیح پر بھی زوال آگیا، آخری وشاح شاعر ابن زمرک ۱۳۹۳ئہ کو بتایا جاتا ہے، کیونکہ اب موشحات کی جگہ ازجال نے لے لی تھی،

اسکے بعد مشرق میں ابن سناء الملک، ابن نبیہ، ابن یوسف تلعفری اور ابن نباتہ وغیرہ فن توشیح کو سینے سے لگائے رہے، چنانچہ آج بھی وہ کسی نہ کسی حالت میں مشرق میں ناپید نہیں ہے، سلیمان بستانی کے موشحات دور جدید کی پیداوار ہیں، مگر ان میں وہ بات کہاں جو غیر تقلیدی موشحات میں پائی جاتی تھی، تاہم فن کے محافظ کی حیثیت سے سلیمان بستانی نے مشرق کا نام روشن کر رکھا ہے، اسکے لیے وہ قابل تعریف ہیں،

موشحہ کا پودا چونکہ گانے بجانے کے عوامی ماحول میں اگا تھا، اس لیے وہ ابتدا میں

غزل، خمریات اور مناظر فطرت کے موضوعات تک ہی محدود رہا، غزل اور خمریات تو مجالسِ عیش و طرب کے لازمی عناصر ہیں، اور قدرتی مناظر کا بیان اندلس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات میں ہے، حسین و جمیل مناظر، شاداب باغوں، دلکش بہاروں، روح پرور فضاؤں، معطر ہواؤں، خوش الحان پرندوں، خوشنما پھولوں، رنگین پھلوں اور چشموں کے تذکروں سے اندلسی شاعری مالامال ہے، موشح کو خاص طور پر لحن و طرب اور نغمہ و نشاط ہی کے لیے وضع کیا گیا تھا، اس کا دامن ان عناصر سے کیونکر خالی رہتا، ابن اللبانہ کے موشحات میں یہ عناصر بڑی خوبی و خوش اسلوبی سے موجود ہیں،

موشحات میں معنی آفرینی اور تخیل کی گہرائی نہ تھی، بس سلاست، حلاوت اور موسیقی پر تمامتر توجہ دیجاتی تھی، عوامی خیالات کو عوامی زبان میں مترنم قوافی سے آراستہ کر کے پیش کر دینا ہی کمال سمجھا جاتا تھا، جس سے موشحات میں ابتذال اور رکاکت بھی پیدا ہو جاتی تھی، بعد میں توشیح میں مدحیہ عناصر بھی شامل ہو گئے، غیر درباری شعراء نے نعتیہ لکھے، مدح کے بعد ہجویہ موشحات بھی کہے جانے لگے، پھر مراثی اور زہدیہ خیالات بھی اسی پیرایۂ بیان سے ادا کیے جانے لگے،

علم عروض کے موجد خلیل بن احمد نحوی نے ۱۵ بحریں ایجاد کی تھیں، اخفش نے سولھویں بحر عربی شاعری کو عطا کی، عموماً ان ہی بحروں کی پابندی ہمیشہ ہوتی رہی، لیکن اندلس کے موشحہ نگار آزاد خیال اور ترقی پسند تھے، طرز کہن سے ان کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، اس لیے اموی سلطنت کے مستحکم ہوتے ہی ہر باکمال شاعر اوزان و بحور میں جدت کا مظاہرہ کرنے لگا، موشحہ کی بحر یکسر جداگانہ ہے، زجل کا بھی یہی حال ہے، یہ انداز آج کی جدید ترقی پسند آزاد شاعری سے بہت کچھ ملتا ہے۔

موشح میں ایک مطلع اور پانچ ابیات ہوتے ہیں، بیت کو اردو محاورے میں بند کہہ سکتے ہیں، ہر بیت کے دو حصے ہوتے ہیں، پہلا حصہ دور اور دوسرا حصہ قفل کہلاتا ہے، پھر ہر دور تین اجزاء سے مرکب ہوتا ہے اور اسکے ہر جز کو سمط (لڑی) کہتے ہیں، اسی طرح ہر قفل میں دو جزو ہوتے ہیں اور اسکے ہر جز کو غصن (شاخ) کہا جاتا ہے، آخری قفل کو خرجہ کہتے ہیں جس طرح پہلا قفل مطلع کہلاتا ہے،

موشحات پر "معارف" میں استاد محترم ڈاکٹر حافظ غلام مصطفی نے ایک طویل و وقیع مقالہ سپرد قلم کیا ہے، مزید وضاحت اور تفصیل کے لیے اس گرانقدر مقالہ کا مطالعہ ضروری ہے[۵]

شعرائے اندلس پر ایک اجمالی نظر

جیسا کہ عرض کیا جا چکا مسلم اسپین (اندلس) علوم و فنون کا مرکز، شعر و سخن کی بزم اور مشرق و مغرب کا سنگم تھا، اس کے ہر شہر کا یہی حال تھا، ابن حمدیس، ابن زیدون، ابن حزم، ابن خطیب، ابن سہل، ابن اللبانہ، ابن زہر، ابن ہانی، ابن خفاجہ اور ابن زیدون جیسے سینکڑوں باکمال شعراء کی نغمہ سرائیوں سے سارا ماحول گونج رہا تھا، ابن زیدون کو سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے، جو خلیفہ مستکفی کی لڑکی ولّادہ کا عاشق تھا جس کی وجہ سے اس کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں، اس کے کلام میں واردات قلب اور سوزش عشق کے ساتھ ساتھ منظر نگاری کا کمال بھی جھلکتا ہے، اس کو ذوالوزارتین (صاحب سیف و قلم) کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا تھا، کیونکہ یہ معتضد عبادی کا امیر فوج اور امیر قرطبہ ابن جہور کا وزیر بھی رہ چکا تھا، ولّادہ خود بھی نہایت باذوق و باکمال حسین و جمیل شاعرہ تھی،

ابن قزمان نے زجل کو بلندی عطا کی، یہ ایک جہاں گشت قسم کا شاعر تھا، موشحہ نگاروں میں ابو العباس اعمی تطیلی جیسے شعراء مشہور ہیں،

---

[۵] ملاحظہ ہو "معارف" مئی و جون ۱۹۷۳ء "فن توشیح" ڈاکٹر حافظ غلام مصطفی

اندلسی شاعری کی تاریخ کو عموماً تین مرحلوں میں منقسم کیا جاتا ہے:

(۱) تقلیدی شاعری (۲) معتدل شاعری (۳) رومانی شاعری

تقلیدی شاعری کا دور ابتدا سے پانچویں صدی ہجری تک رہا تھا، اس ابتدائی دور میں مکمل طور پر مشرق کی تقلید کیجاتی رہی۔ ابن عبد ربہ، ابن ہانی، ابن شہید، اور ابن دراج قسطلی کا تعلق اسی دور سے ہے۔

دوسرا دور اعتدال و توازن کے ساتھ نئے نئے رجحانات سے استفادہ کا تھا، یہ دور پوری پانچویں صدی ہجری پر محیط رہا، جس میں شعراء تقلید مشرق کے ساتھ ساتھ ماحول، مظاہر جمال اور داخلی جذبات و احساسات کو بھی پیش کرنے لگے تھے، اسکے نمائندہ شعراء ہیں ابن زیدون، ابن عمار، معتمد بن عباد اور ابو العباس اعمی تطیلی کے نام سرفہرست ہیں،

تیسرا مرحلہ چھٹی صدی ہجری اور اس کے مابعد پر مشتمل ہے، اس دور میں شعراء اپنے ماحول کی مکمل نمائندگی کرنے لگے تھے، جدت و جودت اس دور کا وصفِ امتیازی ہے، ابن حمدیس، ابن زمرک، ابن عبدون، ابن خفاجہ، ابن سہل اور لسان الدین بن خطیب اس دور کے نمائندہ ہیں،[1]

حاصل کلام یہ کہ شعرائے اندلس نے جہاں ایک طرف قدیم طرز کی مشرقی و روایتی شاعری کے موتی لٹائے، مگر اس میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی، وہیں زجل اور موشحات کے نام سے دو کامیاب اصناف سخن کی بنیادیں ڈالیں، اور اس میں کمال فن کا مظاہرہ کیا، یہ اصناف مظاہر فطرت اور جمال کائنات کی مصوری میں عدیم المثال ہیں، حب الوطنی کے عناصر بھی ان میں موجود ہیں، بحیثیت مجموعی پورے اندلسی ادب کی

[1] جودت الرکابی: فی الادب الاندلسی ص ۱۰۵

روح ان کی فطرت پسندی اور نیچرل شاعری میں ہے، موسیقیت اس کا خصوصی جوہر ہے، اس نئے ادبی موڑ نے تمام مغربی زبانوں کو متاثر کیا، افلاطونی عشق، تخیلیت اور رومان پسندی میں اندلس کی اس جدید شاعری نے نکھار پیدا کیا، فرانس کی طربیہ شاعری بارہویں صدی تک علی الخصوص اندلس کی عربی شاعری سے متاثر رہی، جہاں عربی اسلوب کی فخریہ تقلید کی جاتی تھی،[1] حقیقت یہ ہے کہ اندلس کے عربی شعراء ہی نے پورے یورپ کو "فطرت پسندانہ روایات و جذبات" سے روشناس کرایا، مغربی ادب میں "رومانیت" (Romanticis) کے عناصر کے فروغ میں اندلسی شاعری کی اہمیت مسلم ہے، اس سے انکار ناقدرشناسی اور کفران نعمت سے کم نہیں۔

چند مشہور اندلسی شعراء

اب ہم چند مشہور اندلسی شعراء کا تذکرہ کرتے ہیں،

(۱) **ابن حمدیس**۔ ابو محمد عبد الجبار بن حمدیس صقلی ازدی کا شمار اُن چند باکمال شعراء میں کیا جاتا ہے، جو فطرت کی تصویر کشی اور مظاہر جمال کی عکاسی میں اپنی مثال آپ ہیں، وہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں جزیرۂ صقلیہ کے مشرقی ساحل سرقوسہ کے مقام پر ۴۴۷ھ میں پیدا ہوا، اور وہیں نشو و نما پائی، اسلامی تعلیمات، عربی زبان و ادب اور افسانوں وغیرہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد بچپن ہی سے شاعری کرنے لگا، یہ ملوک الطوائف کا دور تھا، صقلیہ کی سرسبزی و شادابی، خوشگوار فضائیں، صاف شفاف چشمے، لہلہاتے ہوئے باغات، ہرے بھرے درخت، چہچہاتے ہوئے پرندے اور بھانت بھانت کی رومی، اندلسی اور عربی تہذیبیں جو وہاں جلوہ گر تھیں، وہ ابن حمدیس کی شاعرانہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا ذریعہ بنیں، سن شعور کی آنکھیں کھولتے ہی اس نے ملوک الطوائف

[1] الاسلام والحضارۃ العربیہ: محمد کرد علی ص ۲۳۳

کی اطاعت پر لوگوں کو نازاں، عیش وعشرت کا دلدادہ اور شعروسخن کا شیدا پایا،
ان سب باتوں کا اس کی سیرت وشخصیت پر اثر پڑا، وہ طبعاً مذہبی جذبات اور
بلند اخلاق وسیرت کا مالک تھا، مگر کبھی کبھی ماحول کے تقاضے سے لہو ولعب کی مجلسوں
میں نکل جاتا تھا، مگر ان میں گھل مل نہ سکا، وہ صحیح العقیدہ، باوقار وسنجیدہ، نازک مزاج
وحساس، دوررس، محنتی اور پاک دامن شخص تھا، چنانچہ کہتا ہے کہ میں شراب نوشی
کا وصف بیان کرتا ہوں لیکن اسے پیتا نہیں، ٹھیک اس شخص کی طرح جو جنگوں کو
کمانڈ کرتا ہے، مگر خود جنگ کی آگ میں نہیں جلتا،

وآصف الراح ولا اشربھا — وھی بالسند وعلی الشرب تدکو

کالذی یامر بالکرولا — یصطلی نار الوغی حیث تفر

صقلیہ میں عربی حکومت کا آخری دور تھا، فرقہ بندی اور عیش کوشی نے سلطنت
کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا تھا، چارلس مٹیل نے دوسری ہجری میں عربوں کے بارے میں
کہا تھا "عرب سیلاب کے مانند ہیں، ان کا مقابلہ تم نہ کرو، انھیں تم تھوڑی سی ڈھیل
دیدو، قبضہ پانے کے بعد وہ خود ہی لہو ولعب میں مشغول، اقتدار کی رسہ کشی اور خانہ جنگی
میں مبتلا ہو جائیں گے، پھر تم ان پر غالب آجاؤ گے" یہی بات اس دور پر صادق آئی تھی،
جب نارمنڈیوں نے ابن حمدیس کے وطن صقلیہ پر حملہ کیا تو اس کا شباب تھا،
شاعری بھی کرتا تھا، لیکن اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا، اس لیے وہ نارمنڈیوں
کے حملے اور مظالم کی تاب نہ لاسکا، اسپین کی طرف بھاگ نکلا، اور معتمد بن عباد کے
دربار اشبیلیہ پہنچا، عرصۂ دراز تک بادشاہ کی توجہ سے محروم رہا، دربار میں رسائی
حاصل کرنے کے انتظام میں برسوں لگ گئے، اسی مایوسی اور نامرادی کے عالم میں جب

وہ اشبیلیہ چھوڑ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ ایک قاصد پہنچا اور بادشاہ کی طرف سے
دعوت نامہ پیش کیا، ابن حمدیس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، وہ فوراً دربار میں پہنچا، بادشاہ
نے اس کو بڑے اعزاز سے سمور کی قالین پر بٹھایا اور کہا "یہ کھڑکی جو تمھارے پاس
ہے اس کو کھولو، اس نے کھولا تو کھڑکی سے دور اس کو سیسہ کی ایک بھٹی نظر آئی،
جو دہک رہی تھی، اس کو جلانے والا کبھی بھٹی کے دونوں پٹ کھولتا اور کبھی ایک
کھولتا اور ایک بند رکھتا تھا، پھر اس نے مستقل طور پر ایک کو کھول دیا، اور ایک کو
بند رہنے دیا، بادشاہ نے کہا اچھا میرے مصرعوں پر جو میں پڑھوں گرہ (تضمین) لگاؤ

انظرھما فی الظلام قد نجما — دیکھو ان دونوں کو اندھیرے میں چمک رہے ہیں۔

اس پر ابن حمدیس نے برجستہ کہا

کما رنا فی الدجنۃ الاسد — یوں جیسے تاریکی میں شیر کنکھی باندھ دیکھ رہا ہو

بادشاہ: یفتح عینیہ ثم یطبقھا — جو اپنی آنکھیں کھولتا اور موندتا ہے

ابن حمدیس: فعل امرئ فی جفونہ رمد — بالکل اس شخص کی طرح جسکی آنکھیں آئی ہوئی ہوں

بادشاہ: فابتزہ الدھر نور واحدۃ — اور پھر گردشِ ایام نے اسکی روشنی چھین لی

ابن حمدیس: وھل نجا من صروفہ احد؟ — اور کیا گردشِ ایام کی زد سے کوئی بچا ہے

اس برجستگی پر بادشاہ بہت خوش ہوا، انعام واکرام سے نوازا اور اپنا مقرب
بنا لیا، ابن حمدیس عرصۂ دراز تک شاہانہ لطف وکرم سے متمتع ہوتا رہا، تاآنکہ یوسف
ابن تاشفین نے اشبیلیہ فتح کرکے معتمد کو جلاوطن کر دیا، ابن حمدیس بھی اس کے ساتھ
جلاوطنی کی زندگی گزارتا رہا، چار سال کے بعد معتمد فقروفاقہ میں مبتلا ہو کر مرگیا تو ابن حمدیس
افریقہ کے دار السلطنت مہدیہ، پھر وہاں سے میورقہ چلا گیا، جہاں اندھا ہو کر تنگدستی

وہ مفلسی کی حالت میں اس دنیا سے کوچ کر گیا،

ابن حمدیس کی شاعری | فنی لحاظ سے ابن حمدیس کی شاعری کو تین حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے

(۱) صقلیات (۲) وصفیات (۳) اخلاقیات

صقلیات سے مراد وہ قصائد ہیں جنھیں ابن حمدیس نے حب وطن کے سچے اور فطری جذبات و احساسات کو پورے جذب و شوق کے ساتھ بیان کیا ہے، ان ہی میں وہ مراثی بھی ہیں جو اس نے اپنی بچی اور اپنی باندی جوہرہ کی موت پر کہے تھے، اس کے ایک ہمعصر شاعر (ابو الوطن الصقلی) نے کہا تھا "چونکہ میری اصل (نژاد) زمین کی مٹی سے ہے لہذا تمام روے زمین پر میرا وطن اور تمام زمین پر بسنے والے لوگ میرے اقربا ہیں"

اذا کان اصلی فی التراب فکلها　　　بلادی وکل العالمین اقاربی

ابن حمدیس اسکے خلاف تھا، وہ وطن کی محبت کو ایک مثالی محبت قرار دیتا ہے، وہ حب وطن کا دم بھرتا ہے اور کہتا ہے کہ محبوب کسی ہرن کے بچہ کی طرح ہے، میں برابر اسکے عشق میں سرشار رہتا ہوں، اس کی جائے قیام کی طرف میری کشش کا عالم یہ ہے کہ جیسے وہی میرا وطن ہو جہاں میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا ہ

شأ احن الی هواه کانه　　　وطن ولدت بأرضه ونشئت

وصفیات | ابن حمدیس کی توصیفی شاعری کا جواب نہیں، شعرا لوصف میں اکثر قطعات ہیں، اور لمبے قصائد اکثر خمریات کی توصیف اور داخلی جذبات کے اظہار سے متعلق ہیں، اس ذیل میں کئی چیزوں کا وصف اس نے بیان کیا ہے:

(ا) نیچر (طبیعہ) کا وصف　(ب) جنگ و جدل کا وصف　(ج) خمریات کا وصف

نیچر کی تصویر کشی :-

نثرا لجو علی الارض برداً　　　ای درٍ لنحورٍ لو جمد

فضا نے زمین پر اولے بکھیر دیے، کیسے شاندار موتی ہیں، اگر جم جاتے تو حسین گردنوں کی زینت بنتے۔

اخلاقیات | اخلاق و حکم کی شاعری میں دو قسم کے خیالات ہیں: (الف) زہدیہ (ب) دانائی و دانشوری کی باتیں۔

ابن حمدیس بڑا برجستہ گو، قادر الکلام، فطرت نگار شاعر تھا، اس کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ ہے، جس میں دلکش تشبیہات و استعارات کے پردے میں معانی آفرینی کے لعل و گہر پائے جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے وہ ابو العتاہیہ کی زہدیہ شاعری سے بہت متاثر تھا، بحتری کا غنائی رنگ اور متنبی کا تفلسف بھی اسکے یہاں کچھ کم نہیں ہے، وہ اکثر بھولی بسری یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بچپن کی بے فکریوں، شباب کی رنگینیوں، پھر گردش ایام کی سرد مہریوں اور بڑھاپے کی تلخیوں کو موثر انداز میں بیان کرتا ہے، درمیان درمیان میں عبرت آموز باتیں بھی آتی رہتی ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زہد و تصوف سے ابن حمدیس کا کوئی تعلق نہ تھا، صرف محض "برائے شعر گفتن" یا برائے بیت اس کو ظاہر کرتا تھا، لیکن مشہور نقاد عبد المنعم خفاجہ نے اپنی کتاب قصۃ الادب فی الاندلس میں اس کی تردید کی ہے، اس نے لکھا ہے کہ اس کا مقصود جولانی طبع اور تفنن خیال نہ تھا، بلکہ واقعتہً وہ اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا، ورنہ اس کے کلام میں یہ تاثیر پیدا نہ ہوتی، بینائی زائل ہونے کے بعد ابن حمدیس کی وصفیہ شاعری بام عروج پر پہنچ گئی، بسا اوقات غریب و نامانوس الفاظ بھی لے آتا ہے، لیکن ان کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے سیل رواں میں سنگ ریزے۔ شریف رضی اسکے پچاس سال پہلے کا

شاعرہے، اس کے یہاں روانی وسلاست زیادہ ہے، لیکن محسوسات کو معقولات اور معقولات کو مجسم (Personify) شکل اور دلکش انداز میں پیش کرنے کی جیسی مثالیں ابن حمدیس کے یہاں ہیں شریف کے یہاں نہیں ہیں، بے شبہ ابن حمدیس فکرانگیز وجدانی ونفسیاتی خیالات کے لحاظ سے امتیازی حیثیت کا حامل ہے، اسکے کلام میں واقعیت اور رومانیت کے ساتھ ساتھ خوشی، غمی، حیرت وشک، امید وبیم، رنجش والتفات اور راز ونیاز کے احساسات وتخیلات ایسے بلیغ اسلوب میں موجود ہیں جس سے ہمارے فکر وشعور کا ایک ایک تار جھنجھنا اٹھتا ہے۔[1]

(۲) **ابن سہل** : مسلم اسپین کے یہودی مستعربین میں ابواسحٰق ابراہیم بن سہل اشبیلی کا نام انتہائی نمایاں ہے۔ ابن سہل کی ولادت ۶۰۹ھ میں موحدین کے زمانہ میں اشبیلیہ میں ہوئی اور وہیں نشو ونما پائی، یہ خلیفہ منصور کے لڑکے ابوعبداللہ محمد الناصر کی خلافت کا دور تھا۔

العقس ہشتم اور اس کی اسپینی فوجوں کے ہاتھوں موحدین کی پسپائی ابن سہل نے اپنی آنکھوں سے دیکھی، اور اسی ہنگامہ خیز ماحول میں اس نے شباب کی منزلیں طے کیں، اس زمانہ میں اشبیلیہ لہو ولعب اور موسیقی وغنا کی خود فراموشیوں میں اس طرح ڈوبا ہوا تھا کہ سیاسی انقلاب اور گردش ایام بھی اس کو ہوشیار نہ کرسکے، ابن سہل بھی اس ماحول سے متاثر ہوا، اس دور کے یہودی بھی عربی زبان وادب کی تعلیم وتدریس کی طرف متوجہ اور اسلامی تمدن میں رنگ چکے تھے، صاحب نفح الطیب کی روایت کے مطابق ابن سہل نے کہا:

---

[1] مقدمہ دیوان ابن حمدیس : ڈاکٹر احسان عباس (ملخصاً) مطبوعہ بیروت

اموسی، آیا بعضی وکل حقیقة　　　ولیس مجازا قولی الکل والبعضا

(اے موسیٰ کہ جو نہ صرف میری شخصیت کا حصہ ہے بلکہ حقیقۃً میرا جسم اور میری جان ہی ہے، اور یہ بات مجازاً نہیں کہی جارہی ہے)

یہ شعر ابن سہل کی حضرت موسیٰ سے عقیدت کا ثبوت ہے، لیکن ابن حبان کا خیال ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں بلکہ موسیٰ ایک یہودی کا لڑکا تھا جس سے ابن سہل کو محبت تھی، ان کے الفاظ میں اکثر شعرہ فی صبی یہودی کان یہواہ وکان اسمہ موسیٰ بن عبد الصمد۔ اس کے ثبوت میں یہ اشعار پیش کیے ہیں،

هتف الناعی بشجوا الابد　　　اذ نعی موسی بن عبد الصمد

ما علیهم، ویحهم لو دفنوا　　　فی فوادی قطعة من کبدی

جب موت کی خبر دینے والے نے موسیٰ بن عبد الصمد کی موت کی خبر دی تو گویا دائمی غم والم کی خبر دی، کاش وہ میرے جگر کے ٹکڑے کو میرے دل میں دفن کرتے۔

صاحب فوات الوفیات نے اس کے اسلام کے ثبوت میں اس کے وہ اشعار پیش کیے ہیں جو اس نے موسیٰ اور محمد دو نوجوانوں کی مدح میں کہے تھے،

ترکت هوی موسی لحب محمد　　　ولولا هوی الرحمن ما کنت اهتدی

میں نے موسیٰ کی محبت کو محمد کی محبت کی وجہ سے ترک کردی، اور اگر رحمٰن (اللہ) کی طلب نہ ہوتی تو میں راہ یاب نہ ہو پاتا۔

اس کے بعد کہتا ہے:-

وما عن قلی منی ترکت، وانما　　　شریعة موسی عطلت بمحمد

اور اس پر میں مورد عتاب نہیں ہوسکتا کیونکہ محمد کی شریعت نے موسیٰ کی شریعت کو معطل کردیا ہے

ابن سہل نے عربی علوم کی تعلیم ابو علی شلوبین ابو الحسن دباج جیسے جلیل القدر
اشبیلی علماء سے حاصل کی۔ مسلمانوں سے میل جول اور علمی ادبی تعلقات کی بنا پر ابن سہل
جلد ہی عربی زبان و ادب کا ماہر بن گیا۔ شعر و سخن کے میدان میں بڑی ناموری حاصل
کی۔ اس کی شاعری کی ابتدا کا یہ واقعہ بتایا جاتا ہے کہ مشہور شاعر ہیثمی ایک بار
شاہ اندلس متوکل علی اللہ کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ سب لوگ ہمہ تن گوش
تھے کہ اتنے میں ابراہیم بن سہل نامی ایک بچہ نے بھرے دربار میں کہا "جناب والا
فلاں شعر کے بعد اگر آپ یہ شعر بڑھا دیتے تو قصیدہ میں چار چاند لگ جاتے۔

أعلامه السود اعلام لسؤدده — كأنهن بخد الملك خيلان

ہیثمی نے پوچھا "یہ شعر ہے کس کا؟" بچہ نے جواب دیا "میرا ہے میں نے ابھی کہا ہے"
سب لوگ اس برجستہ گوئی ذہانت اور اصلاح و اضافہ پر نہایت مسرور و متاثر
ہوئے۔ ہیثمی نے کہا "خدا کی قسم اگر یہ بچہ زندہ رہ گیا تو اندلس کا سب سے بڑا شاعر
ہو کر رہے گا۔ (واللہ ان عاش هذا ليكونن اشعر اهل الاندلس)

ابن سہل کے مذہب کا معاملہ ابھی تک مختلف فیہ ہے۔ المقری صاحب نفح الطیب نے
عبد اللہ بن مرزوق سے روایت کیا ہے کہ ابن سہل کی موت اسلام پر ہوئی۔ بعض لوگوں
کا خیال ہے کہ وہ محض ظاہری طور پر اسلام کا اظہار کرتا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ
ایک مرتبہ اس نے اپنے مذہب سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "للناس
ما ظهر ولله ما استتر" (اندر کی بات اللہ جانے لوگوں کو تو وہی بات ماننی چاہئے
جو ظاہری طور پر ہو) ایک مرتبہ والی اندلس نے یکساں مفہوم کے تین اشعار سنا کر کہا
پہلے شعر میں عربی شہزادے، دوسرے میں عربی شاعر اور تیسرے میں کسی یہودی اور

ذمی کی نفسیات کی جھلک ظاہر ہے اور ہر ایک کا ظرف الگ الگ نمایاں ہے"
تحقیق سے معلوم ہوا کہ تینوں اشعار علی الترتیب امرؤ القیس، متنبی اور ابن سہل کے تھے۔
بہر کیف اسلامی تعلیمات کی روح اس کے کلام میں نمایاں ہے۔ اس کا مشہور عینیہ قصیدہ
نعت رسولؐ، ذکر الٰہی، قافلۂ حجاج کی روانگی اور مناجات رسولؐ کی تنویر سے منور ہے۔

وہ کہتا ہے:

تكاد مناجاة النبي محمد — تنم بها مسكا على الشم ذائعا

اس قصیدہ میں اس نے یہ تمنا بھی ظاہر کی ہے کہ کاش اس کا جسم نہیں تو دل ہی
قافلۂ حجاج کے ساتھ خانۂ کعبہ تک رسائی حاصل کرتا۔ یہ قصیدہ چونکہ اس نے چالیس
سال کی عمر کے بعد لکھا تھا۔ اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ آخر میں ضرور مشرف باسلام
ہو گیا ہو گا۔

وہ اندلسی الاصل ہونے باوجود عربی اندلسیت پر بھی فخر کرتا ہے۔ اس کے
کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اندلس میں عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا حامی تھا چنانچہ
جب لاون اور قشتالہ کی حکومتوں نے متحدہ محاذ بنا کر ۱۲۴۸ء میں اشبیلیہ پر حملہ کیا
اور دو سال کے سخت محاصرہ کے بعد اسکو فتح کر لیا تو ابن سہل نے ایک بڑا پر زور قصیدہ
لکھا جس میں عربوں کی غیرت و حمیت کو ان الفاظ میں ابھارا ہے۔

يا معشر العرب الذين توارثوا — شيم الحمية كابراً عن كابر
ان الاله قد اشترى ارواحكم — بيعوا ويهنكم ثواب المشتري
انتم احق بنصر دين نبيكم — ولكم تمهد في قديم الاعصر

اے قوم عرب جسکو غیرت و حمیت نسلاً بعد نسل ورثہ میں ملی ہے، خدا نے تمہاری روحوں کو

خرید لیا ہے اسکو بیچکر مشتری کا ثواب حاصل کرو تم پر اپنے نبی کی دین کی مدد کا زیادہ حق ہے، اور پہلے زمانہ میں بھی تم ہی سے اسکو تقویت حاصل ہوئی ہے۔

جب اسپین اشبیلیہ پر قابض ہو گئے تو وہ اشبیلیہ چھوڑکر والی سبتہ ابن خلاص سے وابستہ ہو گیا۔ اور تقریباً چالیس سال یا اس سے کچھ زیادہ کی عمر میں سنہ ۱۲۵۱ء (مطابق ۶۴۹ھ) میں ڈوب کر مرا۔

ابن سہل کے کلام میں رقت، سلاست اور عجز و مسکنت بےکسی و بےبسی کے جذبات زیادہ ہیں اسی لئے بعض اہل مغرب کا قول ہے کہ اس کے کلام میں عشق اور یہودیت دونوں کی ذلت و مسکنت جمع ہو گئی ہیں، (اجتمع فیہ ذل العشق وذل الیہودیۃ) مگر وہ اندلس کے چند بڑے موشحہ نگاروں میں ہے۔ یوں تو اس نے غزلیات بھی کہی ہیں، مگر موشحات میں اس کا پایہ بہت بلند ہے، اسکے بعض قصائد و موشحات تو گویوں میں زبان زد ہیں۔ جس سے اسکے کلام کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، مقری اور ابن الخطیب جیسے اہل علم نے اس کے کلام پر توجہ کی ہے۔

دوسری خصوصیات کے ساتھ وصف الطبیعۃ (فطرت کی روح کی پُر درد ترجمانی) اسکے کلام میں پوری موجود ہے، آیاتِ قرآنی سے استفادہ اور صنائع و بدائع سے بھی اس کا کلام معمور و مزین ہے۔[1]

(۳) ابن بقی:- ابن بقی جس کا نام یحییٰ تھا، قرطبہ کا رہنے والا تھا۔ اسکی وفات سنہ ۵۴۰ھ میں قرطبہ ہی میں ہوئی۔ تاریخ ولادت کا ذکر کتابوں میں نہیں ہے، یہ دورِ مرابطین کا عظیم المرتبت موشحہ نگار تھا۔ اس کے موشحات نے مشرق سے

---

[1] مقدمہ دیوان ابن سہل (بیروت) البطرس البستانی (ملخصاً)

مغرب تک دھوم مچادی تھی، ابن زہر جیسے باکمال شاعر نے ابن بقی کے موشحات کی تقلید اپنے کئی موشحات میں کی ہے، جس سے ابن بقی کی عظمت کا پتہ چلتا ہے، ابن زہر کا مشہور موشحہ "أیھا الساقی الیك المشتکی" پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ موشحہ پورا کا پورا ابن بقی کے مشہور موشحہ "عبث الشوق بقلبی فاشتکی" کا دوسرا روپ ہے۔

ابن زہر ابن بقی کی توشیح نگاری پر رشک کیا کرتا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ ابن بقی کا درج ذیل موشحہ شعر و سخن کی جان ہے،

أما تری احمد — فی مجدہ العالی لایلحق الحلعہ

فأرنا مثلہ یا مشرق

اس کے کلام میں خمریات کے ساتھ مناظرِ فطرت کی بڑی جاندار عکاسی ہے، دوسرے اندلسی شعراء کی طرح اس نے بھی دلکش پہاڑوں خوبصورت باغوں، معطر ہواؤں، سرسبز چراگاہوں، پھلوں، پھولوں، تناور درختوں، پہاڑوں جنگلوں، ندیوں اور تالابوں کا دلکش انداز میں ذکر کیا ہے۔

ماہ وشوں کے دلکش مرقعے بھی ہیں اسکے موشحات میں امراء و سلاطین کی مدحت سرائی اور مرثیہ خوانی کا عنصر بہت کم ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے۔

یا ویح صب الی البرق لہ نظر — وفی البکاء مع الورق لہ وطر

من اجل بعدی عن صحبی — بکیت دما

کم لی ھنالك من شرب — ووصل دمی

وعسکر اللیل فی الغرب — قد انھزما

عاشق کا برا ہو، بجلی کی طرف اسکی نگاہ لگی ہوئی ہے، اور اگریہ وزاری میں وہ
پپیہے کا ہمصفیر ہے۔ اپنے ساتھیوں سے دور رہنے کی وجہ سے میں خون کے آنسو
رو دیا ہوں، یہاں میرے لیے پینے اور کھل کھیلنے کا کتنا سامان فراہم ہے، اس وقت
جب کہ مغرب میں رات کا لشکر شکست خوردہ ہو چکا ہوتا ہے، (لیکن افسوس کہ
میں ایک فراق زدہ عاشق ہوں)

(۴) ابن اللبانہ:- تعجب ہے کہ ابن اللبانہ جیسے بلند پایہ موشحہ نگار کو اکثر
نقادوں اور مورخین نے نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ اس کا درجہ کسی اندلسی شاعر سے
کمتر نہیں۔ ابن خلدون نے مقدمہ میں اس کا تذکرہ اختصار اور جامعیت سے کیا ہے۔
ابن اللبانہ پانچویں صدی عیسوی کے مایہ ناز اہل علم میں تھا۔ شاعر اور ادیب
بھی تھا۔ اس کے موشحات ادبیات عرب میں قیمتی اضافہ ہیں۔ اس کی وفات میورقہ
میں ۵۰۷ھ میں ہوئی۔ یہ ناصر الدولہ کا زمانہ تھا۔

صالح بن شریف رندی کی طرح مرثیہ گوئی، آہ وزاری، اور حوادث دہر کی توصیف ابن اللبانہ
کا کو بھی امتیاز حاصل ہے۔ اسکے کلام میں حب الوطنی کے جذبات زیادہ ہیں۔ اسمیں اندلس کے
مناظر اور عمارتوں کی پوری تصویر نظر آجاتی ہے۔ یوسف بن تاشفین کے ہاتھوں جب
عبادین کی حکومت کا تختہ پلٹا تو ابن اللبانہ کا کلام اندلس کی بربادی کا نوحہ بن گیا اور میر تقی میر
کے نوحہ کی یاد دلاتا ہے۔ ع دلی کہ تھیں گلیاں اوراق مصور تھیں جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ابن اللبانہ کو انسانی حسن کے ساتھ ساتھ مظاہر فطرت سے بھی عشق تھا۔ اسے گیسو و آنکھ اور رخسار کی ایسی لطیف
تشبیہیں اور تعبیریں کی ہیں جو دلکشی و رعنائی میں اپنی مثال آپ ہیں اور فطرت کی مصوری میں تو اس کا نام سر فہرست ہے
توشیح کو مستقل صنف سخن بنانے میں ابن اللبانہ کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا، اسکے کلام میں ذوق جمال
دلکشی و رعنائی اور موسیقیت کے سوتے ابلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

ظفر نامہ اکبری المعروف بتاریخ خاندان تیموریہ مسمیٰ بہ تیمور نامہ

(عہد اکبری کا ایک مصور نسخہ)

از جناب سید منظر حسین شاہ صاحب علیگ

(۲)

تاریخ الفی "نہ ہونے کا تاریخی ثبوت۔

۱- مسٹر بیورج کا خیال ہے کہ اس نسخہ میں تاریخ الفی کی جھلک موجود ہے!

۲- ڈاکٹر کلیم الدین احمد پروفیسر شعبۂ تواریخ پٹنہ یونیورسٹی بھی اسے "تاریخ الفی" کی تیسری جلد تسلیم کرتے ہیں۔

لیکن میری تحقیق اور تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ خیال غلط ہے اس کے برعکس خود ظفر نامہ (اکبری) کی جھلک "تاریخ الفی" میں موجود ہے اور وہ "تاریخ الفی" کے ماخذوں میں سے ایک ماخذ ہے۔ اس کے دلائل ملاحظہ ہوں۔ (الف) "تاریخ الفی" کی تیسری جلد چنگیز خاں متوفی ۶۲۴ھ کے حالات سے لے کر ۹۹۷ھ عہد اکبری تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ اور زیر بحث نسخہ ۳۴ھ یعنی امیر تیمور کے حالات سے لیکر ۲۲ سنہ جلوس مطابق ۹۸۴ھ عہد اکبری کے حالات تک ہے۔

اگر یہ "تاریخ الفی" ہے تو کیا وجہ ہے کہ ۶۲۴ھ سے ۷۳۴ھ تک اور آخر کے ۹۸۴ھ تا ۹۹۷ھ تک حالات یعنی تیرہ سال کے واقعات نظر انداز کر دیئے گئے؟

"تاریخ الفی" ۱۰۰۵ھ میں مکمل ہوئی۔[۱] زیر بحث نسخہ پر ۸ سنہ الہی کی ایک عرض داشت

[۱] منتخب التواریخ عبد القادر بدایونی۔

اس بات کی شاہد ہے کہ ۱۰۰۰ھ میں تاریخ الفی کی تیسری جلد کی تکمیل سے پانچ سال قبل ہی ظفر نامہ اکبری کا یہ نسخہ مصور ہوکر بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کیا جاچکا تھا۔

رزم نامہ، اور ظفر نامہ (اکبری) کو مصور کئے جانے کا حکم دسونت، بساون اور لعل کو ۲۶ سنہ جلوس یعنی ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء میں ملا[۱]۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ظفر نامہ (اکبری) تاریخ الفی کی تیسری جلد کی تکمیل (۱۰۰۵) سے بارہ[۲] سال قبل یعنی ۹۹۳ھ میں تصنیف ہوچکا تھا اور اس کے مصور کئے جانے کا حکم بھی مل چکا تھا۔

اس عہد کی تاریخوں میں: تاریخ الفی ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے تین حصے ہیں اور تیسری جلد اس نسخہ سے کچھ مطابقت بھی ضرور رکھتی ہے۔ مگر میں نے جن حقائق کو اوپر درج کیا ہے۔ اس سے یہ پوری طرح واضح ہوگیا کہ "تاریخ الفی" کی مدد[؟] زیر بحث نسخہ نہیں لکھا گیا۔ بلکہ خود اس کی مدد سے "تاریخ الفی" کی تیسری جلد لکھی گئی۔ اور اسی سے ظفر نامہ (اکبری) کی ترتیب کی نشان دہی بھی ہوجاتی ہے۔

دو مصور ورق

دہلی آرٹ نمائش ۱۹۴۸ء میں دو مصور ورق 'تاریخ الفی' کے نام سے پیش ہونے تھے[۳]۔

لیکن مولانا آزاد نے اپنے مضمون میں ان اوراق کی ملکیت درج نہیں کی ہے اس لیے موازنہ کرنے میں یہ دشواری پیش آرہی ہے کہ واقعی وہ اوراق "تاریخ الفی" کے تھے۔ یا زیر بحث نسخہ کے علاوہ دو اوراق تھے جو مہمات گجرات ۱۹ سنہ جلوس کے بعد غائب

---

[۱] مغل تہذیب ص ۵۶ محبوب اللہ مجیب [۲] ماہنامہ آجکل ۱۵ دسمبر ۱۹۴۸ء

ہوگئے تھے[۱]۔

لیکن خدا بخش کی اس تحریر "از تغیرات زمانہ بایں حقیر رسید" سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ نادر شاہی اور مرہٹہ کے حملوں، یا ۱۸۵۷ء کے موقع پر دہلی اور لکھنؤ کی وکٹوریہ اسٹریٹ پر جس طرح کتابوں کا ڈھیر بکھیر دیا گیا تھا۔ اور ان کی جلدیں بھی توڑ دی گئی تھیں اس طرح اس قسم کے کسی حادثہ میں اس کتاب کی جلد بھی توڑ دی گئی تھی جو حوادث زمانہ کے ہاتھوں زیر بحث نسخہ خدا بخش خان لائبریری تک پہنچا۔ اور دو ورق کسی اور کو ملے جو دہلی نمائش میں: "تاریخ الفی" کے نام سے پیش کئے گئے۔

"تاریخ الفی" کے مصنفین

اس کے مصنفین میں سے ایک جعفر خان بیگ بھی ہیں۔ بدایونی رقمطراز ہے کہ: "ملا احمد ٹھٹھوی نے ۳۶ سنہ رحلت سے کر چنگیز خاں کے حالات تک دو جلدیں ہی لکھی تھیں۔ کہ لاہور کی گلیوں میں مرزا فولاد برلاس نے اسے قتل کر دیا تو اس کتاب کی تکمیل کا کام جعفر بیگ آصف خان کے سپرد کیا گیا، اس نے چنگیز خاں سے لے کر ۹۹۷ھ م ۱۵۸۹ء تک کے حالات قلم بند کئے، پھر بادشاہ کی طرف سے حکم ہوا کہ جو جلدیں ملا ٹھٹھوی نے لکھی ہیں اس پر ملا بدایونی نظر ثانی کریں اور جعفر بیگ اپنی تصنیف کردہ تیسری جلد خود نظر ثانی کریں۔ اس نسخہ کا دیباچہ ابو الفضل نے تحریر کیا۔

---

[۱] غدر دہلی کے حالات میں خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے دست مبارک کے نوشتہ کلام پاک کے چند اوراق پریشاں دستیاب ہوئے۔ اس پر شاہجہانی تحریر بھی موجود ہے اور اس کی فوٹو کاپی بھی شائع کی گئی۔ اسکی جلدوں کو سونے کے حسین کام ہونے کی بنا پر بیچ دیا جاتا تھا۔ اور کتابیں پھینک دی جاتی تھیں"۔ ٹھیک اسی طرح ایک ساہوکار نے پچاس ساٹھ برس قبل ایک حمائل شریف ۱½ × ۳ جس کے صفحات پر سونے کا بڑا حسین کام ہوا، بہت باریک چکنا کاغذ ہو کتب نذیر و مطربیا بھاگلپور بھیج دیا تھا اسکے لوح پر کوئی مہر نہیں لیکن یہ نسخہ عہد اکبری یا جہانگیری معلوم ہوتا ہے۔

اس طرح "تاریخ الفی" کا کام جسے ۹۹۰ھ میں ملا احمد ٹھٹھوی نے شروع کیا تھا۔ [illegible]ھ یا ۱۰۱۵ء رحلت میں مکمل ہوا[1]۔

اس لئے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ تاریخ الفی کی تیسری جلد کا مصنف جب آصف خان جعفر بیگ ہے۔ تو اس نسخہ کا مرتب بھی وہی ہے۔

نسخہ کے مرتب آصف خان (ثالث) کے حالات زندگی

مرزا قوام الدین جعفر بیگ قزوینی آصف خان (ثالث) المتخلص بہ جعفر، ایران کے شہر قزوین میں ۹۴۸ھ م ۱۵۴۱ء میں پیدا ہوا۔ [اس طرح اکبر شاہ سے ایک سال چھوٹا تھا] یہ مرزا بدیع الزماں کا لڑکا تھا، اور اپنے دادا آغا ملا دولت دار کی طرح شاہِ ایران طہماسپ سے منسلک تھا۔ ۲۲ سنہ جلوس اکبری یعنی ۹۸۴ھ م ۱۵۷۶ء میں اپنے حقیقی چچا غیاث الدین علی بیگ آصف خان (ثانی) کے توسط سے سرکاری ملازمت میں بہ عمر چھتیس سال داخل ہوا۔ لیکن بستی [۲۰ ماہانہ] جیسی قلیل تنخواہ کی بنا پر، مظفر خان کی ملازمت میں بنگال چلا گیا۔ پھر ۹۸۴ھ ۱۵۷۶ء میں فتح بنگالہ کے فوراً بعد دار السلطنت واپس آگیا۔

۹۸۴ھ ۱۵۷۶ء تا ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء تک اس کے حالات نہیں ملتے، یہ وہی دور ہے جہیں اکبر کی قدرشناس نگاہیں اس کی قیمت پہچان چکی تھیں، اسلیے اپنے چچا غیاث الدین آصف خان (ثانی) المتوفی ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء کے خطاب آصف خان سے ۲۸ سنہ جلوس اکبری میں نوازا گیا۔ اور میر بخشی کے عہدے پر دو ہزاری کے منصب دار کی حیثیت سے مامور ہوا۔ چھ سال کے عرصے میں بستی [۲۰ ماہانہ] کے ایک ملازم کا دو ہزاری منصب پر پہنچ جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس دقفہ میں اس نے ضرور کوئی بڑا کارنامہ

---

[1] منتخب التواریخ عبد القادر بدایونی

انجام دیا ہوگا۔ یہ کارنامہ "ظفرنامہ" (اکبری) کی ترتیب تھی۔ جس نے اسے اتنی بلندی پہ پہنچا دیا۔

۱۰۱۳ھ میں جہانگیر کی بغاوت کے بعد بہار کا گورنر بھی رہا، اور عہد جہانگیری ۱۰۲۱ھ پنج ہزاری کے منصب پر پہنچ کر برہان پور میں تریسٹھ ۶۳ سال کی عمر میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوا۔

ممتاز محل اور شایستہ خان کا حقیقی چچازاد بھائی تھا۔ جہانگیر نے شہزادہ پرویز کی اتالیقی بھی اس کے سپرد کی تھی۔

تزک جہانگیری میں ہے ـــــ "آصف خان قابل اور ذہین انسان تھا۔ شعر و شاعری کا ذوق رکھتا تھا۔ اس نے خسرو پرویز کا قصہ منظوم کرکے میرے نام (نور الدین) کی مناسبت سے مثنوی "نورنامہ" سے موسوم کیا۔"

آصف خان طبعاً ذہین، فن ریاضی اور معاشیات میں مہارت کے ساتھ کھیتی باڑی اور باغبانی کا بڑا دل دادہ تھا عقیدۃً آزاد مشرب تھا چنانچہ۔ دین الٰہی کے اٹھارہ حواریوں میں سے ایک اور اکبر کا ہم عمر مصاحب اور منہ چڑھا تھا۔ تاریخ نویسی کے علاوہ شاعری بھی کیا کرتا تھا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ ـــــ شاعری میں اس کی طبیعت نہایت موزوں تھی۔ لیکن اچھی شاعری کی مشق کم تھی۔

آئین اکبری کا بیان ہے کہ تاریخ نویسی کرتا تھا۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ایک ہی کتاب نہیں بلکہ متعدد کتابیں فن تاریخ پر لکھی ہونگی۔

ایک سوال اور اس کا جواب، یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابوالفضل اور بدایونی نے اس کی تصانیف میں ظفرنامہ کا ذکر کیوں نہیں کیا۔

اس جواب یہ ہے کہ یہ نسخہ "ظفر نامہ (اکبری) کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ بلکہ چند کتابوں کے اقتباسات اور شاہی واقعہ نویس کے درج کردہ، واقعات اکبری کا ایک باتصویر مجموعہ ہے۔ اسی لئے ان دونوں نے اس نسخہ کو اس کی تصنیف کی فہرست میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اس نسخہ میں حسب ذیل کتابوں کے اقتباسات ہیں۔ ظفر نامہ شرف الدین علی یزد جس میں ۱۲ تصویریں ہیں (اس کے اقتباسات باب اول ۱ سے لیکر باب ۱۱ تک ہیں۔)

بابر نامہ یا تزک بابری کے اقتباسات ۳۵ اوراق پر مشتمل ہیں۔ جس میں نو۹ تصویریں ہیں۔

ہمایوں نامہ اور تذکرۃ الواقعات کے اقتباسات ۲۲ اوراق پر مشتمل ہیں جن میں تین تصویریں ہیں۔

عہد اکبری کے واقعات :- ۴۳ اوراق پر مشتمل ہیں۔ جس میں ۸ تصویریں ہیں۔

اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ظفر نامہ (اکبری) کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ ظفر نامہ (علی یزد) بابر نامہ ہمایوں نامہ۔ وغیرہ کے اقتباسات کا مجموعہ ہے۔ جس کے ۸۰٪ فیصد اوراق اور ۴۰٪ فیصد تصادیر۔ ظفر نامہ (علی یزد) کے اقتباسات کے عکاس ہیں۔ لہذا اس کا نام بھی خاندانی روایت کے تحت "ظفر نامہ" ہی رکھ دیا گیا کیوں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نام اس نسخہ سے مناسبت نہیں رکھتا۔

اکبر نے ۱۵۸۰ء ؁۹۸۸ھ میں ظفر نامہ۔ اور رزم نامہ" مصور کرنے کا حکم۔ دسونت، بساون اور لعل کو دیا[۱]۔

اور ۱۵۸۴ء تا ۱۵۸۹ء کے درمیان "رزم نامہ" [مملوکہ پوتھی خانہ جے پور

[۱] مغل تہذیب صفحہ ۵۶

جس میں ۱۶۸ تصادیر ہیں] مصور ہوا[۱]۔

جب ۱۵۸۰ء میں "ظفر نامہ" اور "رزم نامہ" دونوں کے مصور کئے جانے کا حکم دسونت وغیرہ کو ملا۔ اور ۱۵۸۴ء تا ۱۵۸۹ء میں رزم نامہ" مصور ہوا۔ تو یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ "۱۵۸۰ء تا ۱۵۸۴ء[۲] کے درمیانی وقفہ میں "ظفر نامہ" بھی مصور کیا گیا ہے"۔

"رزم نامہ" کی طرح اس میں بھی تصادیر ہیں۔ جن کی موجودہ تعداد ۱۳۳ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین تصادیر اور بھی رہی ہوں جو عہد اکبری کے دو تین سال کے گم شدہ واقعات کی اہم کڑیاں ہوں۔

اس نسخہ میں دسونت کی بنائی ہوئی صرف پہلی تصویر ہے۔ کیونکہ ۸۲-۱۵۸۱ء میں دسونت کو دارالضرب [Mint] میں خواجہ عبدالصمد کے ہمراہ کر دیا گیا تھا۔ اور اس نے ۱۵۸۵ء میں خودکشی کر لی تھی اس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ۱۵۸۰ء تا ۱۵۸۱ء میں ظفر نامہ کو مصور کیا جانے لگا تھا۔ اور وہ ۱۵۸۵ء سے قبل ہی مکمل ہوچکا تھا۔

اے، ال، سریواستو کی رائے کے مطابق۔ ۹۸-۱۵۸۴ء[۳] کے دوران ظفر نامہ دیگر

[۱] راجپوت مصوری صفحہ ۳۶ ماہنامہ آجکل ماہ اگست ۱۹۳۰ء The art

[۲] The art of Painting P117-22

[۳] of Painting 117-22 میں سریواستو تحریر کرتے ہیں۔ کہ اکبر نے دارالسلطنت لاہور میں چودہ[۱۴] سال تک قیام کیا۔ اسی زمانہ میں زیادہ تر مصور کتابیں شاہی کتب خانہ کے لئے تیار کی گئیں ——— ان میں سے چند کتابیں آج بھی محفوظ ہیں مثلاً بابر نامہ، خمسہ نظامی، نفحات الانس، بہارالحیات، داراب نامہ، تاریخ الفی، تاریخ رشیدی اور ظفر نامہ۔

کتابوں کے ساتھ دارالسلطنت لاہور میں مصور ہوا۔

مسٹر ایس ای سکہ[4] کا بیان ہے کہ "ان کتابوں کے مصوروں میں بساون لال مکند، کیشو، فرخ چیلہ، جگن ناتھ، دھرم داس، مسکین، ہیشی، نند گوالیاری، سن وان (سنولا) شنکر، مادھو، لچھمن اور راننت خاص طور پر قابل ذکر ہیں ——— یہ صحیح ہے کہ یہ تمام مصور "ظفر نامہ" میں بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اس نسخہ کی پہلی تصویر دسونت کی بنائی ہوئی ہے۔ اور مسٹر سکہ کا نام اس فہرست میں نہیں لکھا ہے کیونکہ وہ ۱۵۸۰ء میں ہی دارالضرب سے منسلک ہو چکا تھا۔ اور ۱۵۸۵ء میں خودکشی کرلی

ان دونوں بیانات کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ظفر نامہ کو مصور کئے جانے کا کام ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ لیکن مسٹر اے۔ ایل سریواستو نے دیگر مصور کتابوں کے ساتھ اس مصور نسخہ کا تذکرہ صرف اس لیے کیا کہ اس کا کام جو باقی رہ گیا ہوگا۔ ۱۵۸۴ء میں ختم ہوا۔

اس لیے ہم اس نسخہ کی مصوری کا دور ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء تا ۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء تسلیم کرتے ہیں۔ یہی زمانہ سنہ کتابت کا بھی ہے۔ کیونکہ کتابت اور تصاویر سازی کا کام ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اور کتابت کی ابتدا ۱۵۸۰ء میں دارالسلطنت اکبرآباد (آگرہ) میں ختم ۱۵۸۴ء دارالسلطنت لاہور میں ہوئی۔

کتب خانہ خدابخش میں موجود عہد اکبری کے چند نسخوں کے مقابلہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ زیربحث نسخہ کا کاتب مولانا باقر ہے[5]۔ کیوں کہ اس کا کتابت کردہ شرح القانون جلد دوم کا ایک نسخہ [Cat, IV, No 29] زیربحث

---

[1] محراب ڈائجسٹ ۱۹۷۷ء

[5] مولانا باقر بن ملا میر علی کا ذکر آئین اکبری نے کاتبین اکبری میں بھی کیا ہے۔

نسخہ کے رسم الخط سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور اس نسخہ کی لوح پر مولانا باقر کا دستخط بھی ثبت ہے۔

خلاصۃ البحث :-

نام کتاب :- ظفر نامہ (اکبری)

نام مرتب :- مرزا قوام الدین آصف خان جعفر بیگی المتخلص بہ جعفر متوفی ۱۰۲۱ھ،

سنہ تصنیف :- سنہ ۲۶ جلوس اکبری ۹۸۸ھ مطابق ۱۵۸۰ء/۹۸۸ھ

سنہ مصوری :- سنہ ۲۶-۳۰ جلوس مطابق ۹۸۸-۹۲ھ/۱۵۸۰-۸۴ء

اختتام سنہ کتابت :- ۹۹۲ھ مطابق ۱۵۸۴ء (لاہور)

نام کاتب :- مولانا باقر بن ملا میر علی۔

ماخذ :- (۱) ظفر نامہ۔ شرف الدین علی یزدی (۲) بابر نامہ [تزک بابری] (۳) ہمایوں نامہ گلبدن بیگم، تذکرۃ الواقعات، جوہر آفتابچی، [اور اس زیربحث نسخے کے اقتباسات۔ "تاریخ الفی" کی تیسری جلد میں نقل ہیں]

مصور :- اس کی مصوری میں گیارہ مسلمان اور اڑتالیس ہندو مصوروں نے حصہ لیا ہے۔ جن میں سب سے زیادہ یعنی پندرہ تصویریں بساون کی بنائی ہوئی ہیں۔ آئین اکبری میں درج شدہ ۱۳ مصوروں میں سے میر سید علی، خواجہ عبدالصمد، ہیشی اور ہری بانس کے نام تصاویر پر نظر نہیں آتے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی تیرہ نام اور موجود ہیں۔

کاغذ :- چکنا، دبیز اور بادامی کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیمائش :- تخمیناً ۱۸ انچ لمبی اور ۱۲ انچ چوڑی۔

جلد :- موجودہ سرخ چمڑے کی جلد بعد کی تیار کردہ معلوم ہوتی ہے۔

قیمت:- عرضداشتوں میں ۱۵۱ ایک سو اکاون مہر قیمت درج ہے۔ دوسری جگہ آٹھ ہزار روپیہ ہے۔ اس طرح آج ۸۰۰۰ روپیہ مغلیہ یا ۱۵۱ ایک سو اکاون مہر اکبری کے حساب سے ۱۹۷۲ئ کے نرخ سے اس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ ہوتی ہے۔

ملاخطات:- شاہانِ مغلیہ اور حکام انگریزی کے علاوہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم، رو ندر ناتھ ٹیگور، سر سی، وی، رمن، گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم وغیرہ کے علاوہ سیکڑوں ادیب، عالم تاریخ دانوں اور محققین نے اس نسخہ کو ملاخطہ کیا ہے۔

گذشتہ سالوں کے معارف کے مکمل فائل

اور

متفرق پرچے

رسالہ معارف علوم و معارف کا گنجینہ، اور مغربی و مشرقی علوم و فنون کی انسائکلوپیڈیا ہے، اسکی شہرت ہندوستان سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گئی ہے، کیمبرج یونیورسٹی کے مشرقیات کے پروفیسر ڈاکٹر نکلسن نے جو مثنوی مولانا روم کے مترجم بھی ہیں اور فارسی مکتوب زبان کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں اسکے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات منتشر صحیح معلومات اور مشرقی و مغربی علوم و معارف کی آمیزش کی بارہا داد دی ہے اس رسالہ کا اچھا خاصا ذخیرہ ہمارے مکتبہ میں جمع ہو گیا ہے بعض بعض سالوں کی مرتب جلدیں بھی ہیں اور ہر سال کے متفرق پرچے تو بتعداد کثیر ہیں، جن صاحب کو ضرورت ہو، دفتر سے خط و کتابت کریں۔

لائبریری کوئی پرائیویٹ اور پبلک کتبخانہ معنوی لمتبار سے اس بیش قیمت ذخیرہ سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔

منیجر دار المصنفین

مخدوم سید قاسم حاجی پوری

از جناب ڈاکٹر غلام مجتبیٰ صاحب انصاری استاد فارسی، ٹی، ان، بی کالج بھاگلپور،

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے اپنے ایک مضمون پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں مطبوعہ معارف نومبر ۱۹۵۴ئ میں مخدوم محمد عیسیٰ تاج کے حالات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ مخدوم ملک فتح اللہ مخدوم محمد عیسیٰ کے خلیفہ تھے . . . . سید قاسم حاجی پوری کے جد کلاں سید ابو الحسن نے ملک فتح اللہ کی خدمت میں ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل کی اور خلافت پائی، ملک فتح اللہ کی دامادی کا شرف بھی انکو حاصل تھا۔

اس مضمون میں سید قاسم حاجی پوری کا تعارف مقصود ہے۔ "م"

دریائے گنگا کے کنارے شہر حاجی پور (موجودہ صدر مقام ضلع ویشالی) سے دو میل کی دوری پر مینا پور میں صوفیوں کا ایک قدیم خاندان آباد تھا۔ اس دریا کے شمالی کنارے پر ایک بلند خطہ آج بھی موجود ہے جہاں چھوٹے بڑے مقبرے اور مزارات اور ایک اینٹ کی مسجد کے کھنڈرات اپنی گذشتہ عظمت و شان کی نشاندہی کر رہے ہیں، ان مزارات میں سب سے بڑا اور نمایاں مزار حضرت پیر دمڑیا کا مزار کہ نام سے مشہور ہے اس مزار کے سامنے متوازی الدین میں دریائے مذکور کے جنوبی کنارے پر پٹنہ کے مشرقی حصے میں بھی ایک ایسا ہی مزار ہے۔ اس مزار کے متصل ایک قدیم مسجد ابھی تک قائم ہے جو پیر دمڑیا کی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ پیر دمڑیا کا یہ لقب دو بزرگ صوفیوں (باپ اور بیٹے) یعنی سید احمد اور سید محمد کے ناموں سے منسلک ہے۔

پیر دمڑیا اول یعنی حضرت سید احمد کے والد کا نام سید حسن دانشمند تھا، جو میرٹھ اور دہلی کو ہجرت کر کے صوبہ بہار میں وارد ہوئے، اور ضلع سارن کے حسن پورہ عشری محلہ میں میر ملک فتح اللہ کے مشہور مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ میر ملک فتح اللہ سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ کی اولاد میں تھے اور اپنی بزرگی اور تقویٰ کی وجہ سے عوام میں بہت معروف و مقبول تھے۔ بقول شاہ عنایت حسین مصنف "حالات خاندان دمڑیا بابا"[1] ان بزرگ کی ایک صاحبزادی تھیں، ان کا ارادہ تھا کہ کسی عالی خاندان صاحب علم و معرفت سیدزادے سے اس کی شادی کریں گے۔ اتفاق سے جب رات کے وقت میر صاحب کی کنیز حسب معمول طالب علموں کا کھانا لیکر آئی تو دیکھا کہ سید حسن دانشمند کمرے میں ایک چوکی پر بیٹھے کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہیں، سرہانے چراغدان رکھا ہے اور زیادہ رات گذر جانے کی وجہ سے ان پر غنودگی طاری ہے۔ نیند کی وجہ سے جب کبھی ان کا سر چراغدان پر جھک جاتا ہے، تو چراغدان خود بخود پیچھے کی طرف ہٹ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چراغدان کو کوئی پیچھے کی طرف کھینچ لیتا ہے۔ کنیز یہ حالت دیکھ کر متعجب ہوئی، اور واپس جاکر میر ملک سے یہ واقعہ بیان کیا۔ میر صاحب فوراً گئے اور اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھا۔ اس وقت تو یہ خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے، مگر جب صبح ہوئی اور سید حسن دانشمند سبق لینے ان کے پاس آئے تو انھوں نے فرمایا کہ میری ایک لڑکی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی شادی آپ سے کر دوں۔ سید حسن دانشمند نے دست بستہ عرض کیا حضرت! میں اپنی بیوی اور ایک بچی کو چھوڑ کر حصول تعلیم کے لیے یہاں آیا ہوں اگر شادی شدہ نہ ہوتا تو عدول حکمی کی جرأت نہ کرتا۔

[1] ملاحظہ ہو۔ "حالات خاندان دمڑیا بابا" (مخطوطہ) کتب خانہ پیر دمڑیا بابا، خلیفہ باغ، بھاگلپور،

میر صاحب نے فرمایا اچھا! کل ہم دونوں ایک جگہ بیٹھکر مراقبہ کریں گے، اس کے بعد جیسی مصلحت ہوگی اس پر عمل کریں گے، چنانچہ صبح کو جب سید حسن دانشمند استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے، دونوں نے مراقبہ کیا، اتفاق سے اس درمیان میں سید حسن دانشمند کی بیوی اور بچی دونوں رحلت کر گئیں، اس کے بعد انھوں نے میر ملک صاحب کی لڑکی سے شادی کر لی اور یہیں رہ گئے۔

اس شادی سے سید حسن دانشمند کو جو اولادیں ہوئیں اُن میں سے دو لڑکے سید چند ن اور سید رزاق لاولد فوت ہو گئے، باقی تین لڑکے یعنی سید احمد پیر دمڑیا، سید مبارک اور سید حسین نے طویل عمر پائی، ان تینوں کی شادیاں بہار کے شریف خاندانوں میں ہوئیں۔ سید حسن دانشمند کی وفات ۹۰۶ھ میں حسن پورہ عشری میں ہوئی انکا مزار یہیں ہے، خادم حسین نے قطعۂ[1] تاریخ وفات کہی۔

بود شاہی بکشور دانش	میر سید شدہ بدار فنا
خردم سفت دُرِ تاریخش	واصل حق شدہ سر علما

(خادم حسین) لکھتے ہیں کہ یہ وہی سید حسن دانشمند ہیں جنھوں نے ہندوستان میں ہمایوں کی حکومت کو شیر شاہ کی حکومت پر ترجیح دی تھی اور ہمایوں کے لیے دعا دی تھی چنانچہ ہمایوں جب شیر شاہ سے شکست کھا کر قندھار چلا گیا۔ اور وہاں سے جب دوبارہ ہندوستان آیا تو سید حسن دانشمند کی مدد معاش کے لیے ایک بڑی جائداد حسن پورہ عشری اور حاجی پور میں عطا کی۔ کہا جاتا ہے کہ حسن پورہ محلہ کا نام بھی انہی کے نام پر مشہور ہوا۔ سید حسن دانشمند کے تین لڑکوں میں سید مبارک حسن پورہ عشری میں سکونت پذیر ہوئے، سید حسین بھاگلپور چلے گئے اور سید احمد اپنے والد سے رخصت لیکر سیاحت کے لیے

[1] تذکرہ تاج العلماء معہ رحلت نامہ (مخطوطہ) از خادم حسین کتب خانہ پیر دمڑیا بابا خلیفہ باغ، بھاگلپور،

نکل گئے اور سفر کے دوران میں بہت سے صوفیوں اور ولیوں سے ملے سیاحت سے واپسی کے بعد مینا پور، حاجی پور میں تشریف لائے اور یہیں قیام پذیر ہوئے، ان کا انتقال ۱۰۹۹ھ میں ہوا۔ اور مینا پور میں دفن ہوئے قطعہ تاریخ وفات یہ ہے۔[1]

آں ولیعہد خاندان نبیؐ	رہنون قوم و پیشوائی قوم
خرد بس معرفت اللہ نمود	سال رحلت عرف تگ بود

ایک اور تاریخ "مشتاق لقا" ہے۔

سید احمد پیر دمڑیا کے تین لڑکے ہوئے۔ تینوں قطب زمان اور آفتاب دوران تھے، پہلے صاحبزادے کا نام مخدوم سید محی الدین عرف امیر بڑھ تھا، انھوں نے اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت کی اور صاحب کشف و کرامات ہوئے۔ پھر اپنے چچا کے ساتھ حسن پورہ عشری میں اپنے دادا کے سجادہ نشین ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۱ محرم ۱۰۱۲ھ میں ہوا، تاریخ وفات[2] حسب ذیل ہے۔

امیر بی نظیر میر بڑھان	کہ شاہی داشتند از وی گدایان
ز سال ارتحال او دلم گفت	ولی بودند صدر مقتدایان

ان کا مزار حسن پورہ عشری میں سید حسن دانشمند کے مزار کے صحن میں واقع ہے۔

مخدوم سید قاسم حاجی پوری (صاحب دیوان و مثنوی) سید احمد پیر دمڑیا کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ ان کا تخلص "قاسم" اور لقب "صدر الدین جمال الدین زبدۃ النقبا محمود العقبی مقتدائے اعظم" تھا۔

---

[1] تذکرہ تاج العلما معہ رحلت نامہ (مخطوطہ) از خادم حسین، کتب خانہ پیر دمڑیا بابا، خلیفہ باغ، بھاگلپور۔ [2] تاج العلما معہ رحلت نامہ، مخطوطہ۔

میر ملک فتح اللہ کے انتقال کے بعد ان کے داماد سید حسن دانشمند ان کے سجادہ نشین ہوئے اُن کے بعد ان کے لڑکے سید احمد پیر دمڑیا بابا کو حاجی پور کی خانقاہ کی سجادگی حاصل ہوئی۔ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مینا پور کی خانقاہ حسن پور عشری کی خانقاہ ہی کی ایک شاخ تھی۔ جس کا انتظام وہیں سے ہوتا تھا۔

خادم حسین کی تحریر کے مطابق سید احمد پیر دمڑیا کے تین لڑکے تھے، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ لیکن حالات خاندان پیر دمڑیا بابا کے مصنف سید شاہ عنایت حسین (متوفی ۱۲۹۰ھ) نے دو ہی بیٹوں کا ذکر کیا ہے، مخدوم سید محی الدین عبد القادر عرف امیر بڑھ کا ذکر نہیں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"حضرت سید احمد کہ لقب اونکا پیر دمڑیا ہوا اور محلہ مینا پور میں مزار مبارک اونکا ہوا۔ یہہ فقیر باقبائل وہاں جاکر مشرف ہوا ہے، سبحان اللہ! مزار شریف ایک ڈال سنگ مرمر ہے اور آپ کی اہلیہ کا مزار بھی سنگ مرمر ہے، اور مینا پور ایک موضع متعلقہ مقام حاجی پور تختگاہ شاہان قدیم واقع در ضلع مظفر پور عبور گنگ برابر شمال پٹنہ کہ معروف شہر عظیم آباد ہے اور آپ کے دو بیٹے ہوئے نام بڑے صاحبزادے کا سید محمد ہے یہ بھی مقلب پیر دمڑیا ہے مزار ان کا شہر عظیم آباد میں جو محلہ نون گولہ اور معروف گنج معروف ہے اور اسی محلہ کو پیر دمڑیا بھی لوگ کہتے ہیں، اور چھوٹے بیٹے کا نام حضرت سید قاسم ہے، مزار حضرت سید قاسم کا موضع سید پور اور لیس متصل مقام موضع جروحہ کے ہے اور مینا پور اور سید پور مخلوط سیوانہ ہے اس فقیر نے تمام بزرگوں کے مقابر پہ حاضر ہو کر فاتحہ پڑھا ہے"۔

سید قاسم حاجی پوری کی پیدائش اور تعلیم کا حال تفصیل کے ساتھ کہیں نہیں ملتا؛

ان کی پیدائش کی تاریخ کا ایک ذریعہ ان کے چچا سید حسین کی بیاض ہے جو کتب خانہ پیر دمڑیا بابا، خلیفہ باغ بھاگلپور میں موجود ہے اس میں ان کی پیدائش کی تاریخ ۱۵ محرم الحرام تحریر ہے مگر سنہ کی جگہ خالی ہے، اس کی وجہ سے ان کی پیدائش کے سال پر روشنی نہیں پڑ سکی، ان کے فارسی دیوان[1] کے قلمی نسخے پر "متولد حدود ۹۴۰ھ" ثبت ہے وہ کاتب کے ہاتھ کی تحریر نہیں۔

قیاس ہے کہ مروجہ علوم انھوں نے اپنے والد ماجد سے حاصل کیے ہونگے غزلوں میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا خوبصورتی کے ساتھ استعمال اس کا ثبوت ہے کہ عربی اور فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور تصوف و روحانیت کے تمام مقامات سے واقف تھے۔

قاسم حاجی پوری کو اپنے والد سید احمد پیر دمڑیا سے بیعت اور خلافت حاصل ہوئی، والد کے انتقال کے بعد مینا پور، حاجی پور میں ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ ان کی والدہ مخدوم سید محمود چشتی کی صاحبزادی تھیں۔ انھوں نے چار شادیاں کیں۔ ان بیویوں سے نو لڑکے ہوئے اور سات لڑکیاں۔ پہلی بیوی پیر سید بڈھے بن مخدوم پیر برادر مخدوم سید حسن دانشمند کی صاحبزادی تھیں جن سے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ لڑکے کا نام محمود تھا۔ جو بچپن ہی میں فوت ہوگیا۔ دوسری بیوی مریم تھیں جن کے بطن سے دو لڑکے سید یوسف اور سید ابراہیم ہوئے، سید یوسف کی شادی بی بی ادلیا بنت سید جلال الدین بن سید حمزہ رسولدار ساکن رام بدر معروف بہ چکبدہ پرگنہ حاجی پور، سے ہوئی، تیسری بیوی سیدہ بخاری بنت سید علی بخاری قنوجی تھیں

---

[1] دیوان غزلیات سید قاسم حاجی پوری، مخطوطہ کتب خانہ پیر دمڑیا بابا، خلیفہ باغ بھاگلپور (اس کی ترتیب مع مقدمہ میں دے چکا ہوں، طباعت کی مشکلات کا سامنا ہے۔)

ان کے بطن سے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں لڑکوں میں بھی ایک کا نام سید عبداللہ عرف سید حاجی تھا، جو جہانگیر کے زمانہ میں ایک بڑے منصب پر فائز تھے، چوتھی بیوی سہیبو (یا ہیبو) تھیں جن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔

خادم حسین نے اپنی کتاب میں سید قاسم حاجی پوری کے نو لڑکوں کا تو ذکر کیا ہے مگر لڑکیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"و فرزندان مخدوم سید قاسم بن سید احمد پیر دمڑیا بن سید حسن دانشمند سید محمود و سید یوسف و سید حاجی و سید ہاشم و سید علی و سید عبد الرحمٰن و سید سلیم و سید ولی و سید عثمان۔"

سید قاسم حاجی پوری کے روحانی جلال و عظمت کا ذکر شاہ عنایت حسین، اور خادم حسین دونوں نے اپنے اپنے رسالوں میں کیا ہے۔ قاسم حاجی پوری کا انتقال ۴ ذی الحجہ ۱۰۱۳ھ کو مینا پور حاجی پور میں ہوا۔ قطعہ تاریخ وفات حسب ذیل ہے۔

روز رحیل جہاں چہارم ذی الحجہ بود
سال وفات شریف مفخر آل نبی

"مفخر آل نبیؐ" سے مذکورہ سال و تاریخ وفات کی تصدیق ہوتی ہے، ان کا مزار موضع سید پور ادریس میں مقام جڑوہہ (حاجی پور) کے متصل ہے۔ خادم حسین لکھتے ہیں۔

"در چہارم ذی الحجہ ازیں جہان فانی رحیل مکان جاودانی گشتند، مزار مقدس ایشاں اقدس در سید پور است۔"

"و تا یو منا عدالت بر مزار آں حضرت جاریست ہر کسی کہ بہ بلائی ہر گونہ مبتلا شدہ چو کی چند روزی می سازد کامیاب می باشد۔"

دین کی تبلیغ سید قاسم حاجی پوری کا مقصد حیات تھا۔ انھوں نے گاؤں گاؤں میں

گھوم کر اسلام کی تبلیغ کی اور اس نواح میں اسلام کا نور پھیلایا، ان کا کلام صوفیانہ اور عارفانہ خیالات سے معمور ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اصل اور باقی رہنے والی زندگی آخرت کی ہے دنیا فانی اور دھوکا ہے اس کے فریب میں نہ آنا چاہیئے

تو قاسما بطلب حاجات ملک بقا — مخواہ دنیوی فانی پر از متاع غرور

اصل زندگی وہی ہے جو اخدا کی یاد میں گذرے، عمر کا جو لمحہ بھی اس کی یاد اور ذکر کے بغیر گذرا وہ بیکار محض ہے اسلیے حرمان وخسران کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

حیات خود بدیدار تو دانم — عجب باشد کہ بے تو زندہ مانم
زعمرم یک نفس بے تو گذشتہ — ازاں شرمندۂ ہر دو جہانم

کلمہ شہادت سے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔

یک بار کلمہ تو باخلاص ہر کہ گفت — شد محو آنچہ کردہ بہ عمر خود گناہ

اللہ تعالےٰ سے ہمیشہ گناہوں کی معافی مانگتے رہنا چاہیئے۔

گنہگارم توئی آمرزگارم — امید عفو دارم بامعافی

انسان ذات الٰہی کا پرتو ہے، فرشتہ اور حور و پری تک اسکے جمال کے مشتاق ہیں۔

اے شاہد انسان صفت ذات الٰہ — مشتاق جمالت ملک و حور و پری

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کیا جہان میں آپ کا کوئی مثیل نہیں۔

ہم چو صفات ذات تو ہیچ کس ندید — بی مثل آفرید ترا در جہان الٰہ

قاسم کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ وہ شاہ عرب کا غلام ہے۔

قاسما شد غلام شاہ عرب — زان سعید است ہمچو سعد سعاد

قیامت میں اس کو جو کچھ امید ہے وہ محبوب الٰہی کی شفاعت سے ہے۔

قاسم آلودہ عصیاں چہ کند روز حساب — مگر امید کہ محبوب الٰہی است شفیع

عہد ہشام کا سندھ

از جناب ڈاکٹر عبدالباری، لکچرر عربی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

(۳)

۱۲۰ھ میں عراق کی وائسرائلٹی میں ایک بڑی سیاسی تبدیلی آئی۔ وہاں کا مشہور گورنر خالد بن عبداللہ قسری معزول کر دیا گیا۔ اس کی جگہ یوسف بن عمرو ثقفی گورنر مقرر ہوا۔ سندھ عراق کے ماتحت تھا اسلیے اس تبدیلی سے یہاں کی حکومت کا متاثر ہونا ضروری تھا۔ حکم بن عوانہ خالد قسری کا مقرر کردہ افسر تھا۔ اب جب کہ خالد معتوب ہو چکا تھا۔ اور اسکی انتظامی کمزوریوں پر حکومت کی طرف سے مقدمات قائم کئے جا چکے تھے۔ حکم بن عوانہ نے اپنی ذات کے لیے بھی خطرہ محسوس کیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کی بھی سرزنش ہوگی اور سیاسی اختلافات کے نتیجے میں اسے بھی ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔[1] کیونکہ موجودہ وائسرائے یوسف بن عمرو کے خاندان والے اور کلبی قبیلہ کے لوگ ایک دوسرے کے سیاسی حریف تھے۔ حکم بن عوانہ ایک دلیر کمانڈر تھا۔ اس نے سیاسی ادھیڑ بن میں پڑنے اور اپنے حریفوں کے ہاتھوں ذلت و رسوائی اٹھانے سے بہتر سمجھا کہ جہاد فی سبیل اللہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کا مقصد پورا کرلے۔

ہندوستان میں راجاؤں کے معاندانہ رویے نے تادیبی کارروائی کو ضروری بھی

[1] یعقوبی۔ تاریخ، جلد ۲ ص ۳۲۲-۳۱۸

بنا دیا تھا۔ چنانچہ وہ فوج کا ایک دستہ لیکر گجرات کی طرف بڑھا۔ اور سندھ میں مقیم اسلامی سپاہ کی کمان اور حکومت کی نیابت فاتحِ سندھ محمد بن قاسم کے ہونہار لڑکے عمرو بن محمد کے سپرد کر دی۔[1] ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے جام شہادت نوش کرنے کا عزم ارادہ کر لیا ہے۔ گمان اغلب ہے کہ اس کی پیش قدمی گجرات سے سوراشٹر کی طرف ہوئی۔ بقول مجمدار ۷۳۹ء کے قریب سوراشٹر کے علاقے پر سندھوا خاندان کا راجا پشپے دیو برسرِ حکومت تھا۔ جسے حکم بن عوانہ کے ہاتھوں شکست ہوئی تھی۔[2] اس کے بعد وہ دکھنی گجرات کی طرف بڑھا۔ اور نربدا ندی کو عبور کرنے کے بعد "نوسارک" ریاست پر حملہ کیا ہوگا۔[3] اس پیش قدمی میں اس نے ایک طویل مسافت طے کر لی تھی۔ اس لیے جنگی نقطۂ نگاہ سے کمک کا انتظام کرنا اور پیچھے چھوڑے ہوئے مفتوحہ علاقوں پر کنٹرول رکھنا ضروری تھا۔ لیکن ایسے کسی انتظام کا عربی تاریخوں سے پتہ نہیں چلتا ہے، حکومت کے طرزِ عمل سے دلی کی بنا پر حکم بن عوانہ کی یہ مہم جنگی ضابطہ کی پوری کارروائیوں کے ساتھ نہیں تھی۔ اور اس کے دل میں صرف ایک ہی جذبہ باقی تھا اور وہ یہ کہ جہاد کرتے ہوئے جان دے دے۔[4] اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ کمانڈر جس نے ہندوستان کی مشترک افواج کا منہ پھیر دیا تھا۔ اور ان کو نہ صرف سندھ کے حدود سے باہر بھگا دیا تھا۔ بلکہ ان کا تعاقب کرتے ہوئے دکھنی ہندوستان تک پہنچ گیا تھا

[1] یعقوبی تاریخ۔ ص ۳۲۲-۳۱۸ [2] سوراشٹر ان دنوں متعدد خاندانوں مثلاً سندھوا، چالوکیا۔ چاپا وغیرہم کی حکمرانی میں تھا۔ ایک چالوکیا خاندان جوناگڑھ کے قریب بھی حکمرانی کرتا تھا۔ دیکھیے دی۔ ایج آف امپیریل کنوج از مجمدار ص ۱۰۰-۹۸ [3] ایضاً ص ۹۸۔ [4] ایم۔ سی۔ اے، رانا سنگھ ہسٹری آف انڈیا، جلد ۱، ص ۹

دکھنی گجرات کی ایک چھوٹی سی ریاست نوسارکھ کے راجا نا سمرے، پولاکیس سے جو خود بھی
لاتا ریاست کا باجگذار راجا تھا،[۱] شکست کھا گیا۔ اور عوانہ جنگ میں کام آگیا۔[۲]

حکم بن عوانہ ایک مقتدر کمانڈر تھا۔ سندھ کا گورنر بھی تھا۔ اس کی ہیبت سے شمالی
اور جنوبی گجرات دونوں متاثر تھے۔ اس لیے اس کی شہادت کے بعد ان علاقوں نے
اطمینان کی سانس لی اور ایک بڑا خطرہ ہندوستانی ریاستوں کے سر سے ٹل گیا تھا۔
ان علاقوں پر عربوں کی جس قدر دہشت طاری تھی، اس کا اندازہ نوسارک پلیٹ سے
بخوبی ہوتا ہے۔[۳] اس لیے راجہ جنا سمرے کے اس کارنامے پر اسے طرح طرح کے اعزازوں
سے نوازا گیا۔ چالوکیا شہنشاہ نے اسے "دکھنی ہندوستان کا مستحکم ستون" "خاندان چالوکیا
کا جواہر پارہ اور پسپا نہ ہونے والی قوم کا پسپا کرنے والا" جیسے خطابات سے سرفراز کیا۔[۴]
حکم بن عوانہ کی موت سے ایک بار پھر مقامی راجاؤں کے حوصلوں کو نئی زندگی
مل گئی۔ اور سندھ کی اسلامی حکومت بھی تھوڑے عرصے کے لیے سیاسی انتشار
کا شکار ہو گئی۔ اور حکم بن عوانہ کی جانشینی کے لیے یزید بن عرار نامی شخص عمرو بن
محمد کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ عمرو بن محمد نے حکم بن عوانہ کی معیت میں بیش بہا جنگی
اور انتظامی خدمات انجام دی تھیں۔ محفوظہ کے فوجی مستقر سے مقامی افواج کے
خلاف کامیاب جنگی مہموں کی قیادت کی تھی۔ اور دو سال (۱۲۲ھ/۷۴۰ء سے ۱۲۴ھ/۷۴۲ء)
تک سندھ کی گورنری کے فرائض بھی حکم بن عوانہ کے نائب کی حیثیت سے انجام دیئے
تھے۔

---

[۱] دیدیا: میڈیاول ہندو انڈیا، جلد ۱، ص ۲۷۶ [۲] بلاذری، فتوح ص ۴۴۸
ایم۔ سی۔ ر۔ ے: ڈائناسٹک ہسٹری، جلد ۲، ص ۳۶ - ۹۳۵ [۳] تفصیل ص ۱۰، ایہ
گذر چکی۔ [۴] ڈاکٹر ڈی شرما: راجستھان جلد ۱، ص ۱۰۶ - ۱۰۷

عمرو بن محمد کی ان کارگذاریوں کے صلہ میں عراق کے وائسرائے نے انھی کو
۷۴۰ء/۱۲۲ھ میں سندھ کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔[۱] یزید بن عرار اور عمرو بن محمد کی کشمکش
سے سندھ کے مستقل باغی عناصر اور مقامی راجاؤں نے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہا۔
انھیں گمان ہوا کہ حکم بن عوانہ کی موت سے سندھ کی اسلامی حکومت کمزور ہو چکی
ہے۔ اور مسلمان اُن کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکیں گے۔ سندھ پر پیش قدمی کا پلان بنایا۔
اُن کے مقابلہ اور اپنا ایک راجا بھی منتخب کر کے اس کی کمان میں ہند کی افواج منصورہ
پر حملہ آور ہوئیں۔ قیاس یہ ہے کہ یہ راجہ وہی گوہیلا راجہ بپا تھا جس نے چتوڑ کے

---

[۱] بلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۴۶ - ۴۴۸ [۲] بلاذری کی روایت کے مطابق عمرو بن محمد بن قاسم نے شہر منصورہ حکم بن عوانہ کی گورنری کے ایام میں اس وقت تعمیر کرایا جب سندھ کی حکومت کو ہندی افواج کی یورش سے محفوظ کر لیا گیا۔ ساتھ ہی عمرو نے اس شہر کو سرکاری دفاتر کا مرکز بھی قرار دیا۔ سندھ میں شہر منصورہ کی تعمیر دراصل ہندوستان کی سرزمین میں پہلی سب سے اہم شہری تعمیر تھی۔ کیونکہ محفوظہ کی حیثیت ایک مرکزی فوجی چھاونی کی زیادہ تھی۔ لیکن منصورہ ایک وسیع و عریض شہری آبادی کا حامل اور صوبہ کا دارالخلافہ بھی تھا۔ بلاذری کی روایت سے اس کی تعمیر ۷۳۸ء/۱۲۰ھ کے لگ بھگ اور یعقوبی کی روایت کے مطابق ۷۴۰ء/۱۲۲ھ میں ہوئی۔ دیکھیے: فتوح البلدان ص ۴۴۵ - ۴۴۸؛ تاریخ الیعقوبی جلد ۲ ص ۳۴۴۔ پاکستان کے محکمہ آثار قدیمہ نے اس شہر کو کھدائی کے بعد برآمد کر لیا ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز منصورہ کا محل وقوع حیدرآباد ڈویژن کے ضلع سانگھڑ میں متعلقہ سنجھورو ہے۔ جو موجودہ شہر سے شاہ پور سے جنوب مشرق آٹھ میل کی دوری پر ہے۔ یہ ایک میل طویل اور ایک ہی میل عرض میں دریائے سندھ کے مشرقی جانب بسا ہوا تھا۔ یہ جگہ دریائے سندھ کے دو حصوں میں منقسم ہو جانے کی بنا پر ایک جزیرہ کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ شہر فصیل ۲۰ - ۲۵ فٹ تک اونچی تھی۔ اور اس قدر چوڑی تھی کہ آسانی سے گاڑیاں چل سکتی ہیں۔ کچھ دور شمال مشرق میں قدیم نہران[؟] ہی کی اس شاخ کے آثار ہیں۔ جو اب خشک ہو چکی ہے۔ مگر اس عہد میں قلعہ کی دیوار سے ٹکرا کر گذر جاتی تھی۔ قلعہ کی مستحکم بنیادیں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو شہر کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔

موری راجا کو جو اس کا چچا بھی تھا۔ اور مسلمانوں سے شکست کھا گیا تھا تخت سے اتار کر خود حکمران بن گیا تھا۔ بعد میں اس نے عربوں کے خلاف جنگی مہم شروع کر دی اور میواڑ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ جس میں راجستھان کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ افواج کو جب شکست ہو گئی تو اس نے اپنی طاقت بڑھائی اور سندھ کی حکومت کے موروثی حقدار کی حیثیت سے اس کے حصول کی کوششیں شروع کر دیں، کیونکہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے موری خاندان کا راجا ہی سندھ پر حکمران تھا۔

حکم بن عوانہ کی شہادت کے بعد سندھ پر حملہ کا اچھا موقعہ بھی ہاتھ آ گیا تھا۔ حکم کے ہاتھوں مقامی شکست خوردہ افواج کو بھی بپّا کو راجا منتخب کر لینے اور اسکی

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۹) اور زبان حال سے پکار پکار کر بنانے والوں کی چابکدستی کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ قلعہ کی مشرقی، مغربی اور جنوبی دیواریں دریائے سندھ کی دونوں شاخوں کی گذرگاہ سے ملا کر بنائی گئی تھیں۔ اس طرح یہ شہر چاروں طرف دریائے سندھ کے پانی سے گھرا ہوا تھا۔ ایٹ اور آینو وغیرہم مستشرقین کی جماعت کا خیال تھا کہ منصورہ قدیم شہر برہمن آباد پر بسا ہوا ہے، اور اس کے کافی حصے منصورہ میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ دیکھئے ایلیٹ اور ڈاؤسن، ہسٹری آف انڈیا، جلد ۱، ص ۳۷۰-۳۷۱، مطبوعہ لندن ۱۸۶۷ء۔ مگر اب حالیہ تحقیق نے اس دعوے کو غلط کر دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز، برہمن آباد کے آثار منصورہ سے شمال مشرق ڈیپر گھنگرو کے مقام پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ چودھویں صدی عیسوی میں ایک زلزلہ سے یہ شہر تباہ ہو گیا۔ دیکھیے مقالہ از ڈاکٹر ممتاز، اسلامی کلچر جلد ۱۱، ص ۲۷، حیدرآباد ۱۹۵۸ء۔ [1] ایچ۔ سی۔ رے۔ ڈائناسٹک ہسٹری جلد ۲، ص ۱۱۵۲-۱۱۵۹۔ [2] جے۔ ٹوڈ: اینلس آف اینٹیکوٹیز آف راجستھان ج ۱، ص ۱۹۷۔ [3] ڈاکٹر دشرتھ شرما: راجستھان تھرو دی ایجز جلد ۱، ص ۱۰۷

قیادت میں مسلمانوں سے شکست کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا، اور انھوں نے منصورہ کا محاصرہ کر لیا۔ عمرو بن محمد کے لئے یہ صورت حال پریشان کن تھی۔ اس نے عراق سے چار ہزار تازہ دم عربی فوج منگائی، راجہ کے مقابلہ کے لیے نکلا، راجہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور اسکو منصورہ چھوڑ دینا پڑا۔ اس کے بعد عمرو بن محمد نے ایک بڑی فوج ترتیب دیکر ایک دوسرے ہوشیار کمانڈر معن بن زائدہ شیبانی کی معیت میں مقامی افواج پر شب خون مارا۔ دونوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی، راجا کی فوج کا بڑا حصہ کام آیا اور اسکو شکست ہو گئی۔ خود راجا بھی زخمی ہوا۔ بھاگتی ہوئی مقامی فوج اپنے ساتھ . . . . . لے گئی تھی مگر عمرو بن محمد نے ان سب کو شکست دے کر سندھ کے پورے علاقے سے نکال دیا۔ اور ایک بار پھر وہ مسلمانوں کے مکمل کنٹرول میں آ گیا۔ اور عمرو بن محمد ہشام اور عبدالملک کے آخر زمانہ تک سندھ پر حسن تدبیر کے ساتھ حکمرانی کرتا رہا۔

ان تفصیلات سے اندازہ ہو گا کہ ہشام کے زمانہ میں سندھ پر جو نوچکیاں ہوئیں ان کا مقصد اسکو اموی سلطنت کا مستقل بنانا تھا۔ ورنہ عمرو بن محمد منصورہ کو جو سندھ کے آخری سرے پر تھا سندھ کا دارالحکومت نہ بناتا، چنانچہ بلاذری کے عہد ۲۵۵ھ تک منصورہ سندھ کا دارالحکومت اور سندھ انگریزوں سے پہلے تک مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہا۔ اس لیے سندھ کی فتوحات کا افسانہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔

[1] یعقوبی ج ۲ [2] ایضاً [3] فتوح البلدان ۴۵۰-۴۴۸

مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ از احمد شوقی مصری

از جناب مولوی حبیب ریحان صاحب ندوی، لکچرار اسلامک انسٹی ٹیوٹ البیضا، لیبیا،

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت ایک بین الاقوامی شخصیت تھی، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد مولانا نے خلافت کے قیام اور اسلامی رشتۂ اخوت کی بقا کے لیے جو کوششیں کی ہیں انھیں مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

مولانا محمد علی جوہر کا انتقال یورپ میں ہوا۔ اور بیت المقدس میں آپ کو دفن کیا گیا۔ ان کے غم میں تمام عالم اسلامی میں تعزیتی جلسے کیے گیے، مصر میں سرکاری طور پر عظیم الشان تعزیتی جلسہ ہوا۔ جس میں وقت کی سیاسی اور علمی و ادبی اہم شخصیات نے مولانا جوہر کی انسانی و اسلامی خدمات کا اعتراف کیا۔ اس وقت ہم امیر الشعراء احمد شوقی[1] کے مرثیہ کا آزاد ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جو انھوں نے اس تاریخی تعزیتی جلسے میں سنایا تھا، اور جس میں بیت المقدس کی مقدس[2] اور لعل و جواہر لبریز

---

[1] پیدائش ۱۸۶۸ء وفات ۱۹۳۲ء کہا جاتا ہے کہ عربی زبان نے ایک ہزار برس میں ایسا شاعر پیدا نہیں کیا۔ [2] قرآن کی زبان میں "بارکنا حولہ" مفسرین نے لکھا ہے کہ اقتصادی برکات نیز انبیا کی آمد وغیرہ مراد ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مراد یہ ہے کہ وہ انبیاء کا مدفن ہے، اقبال نے دہلی سے غالب کے متعلق یقیناً مبالغہ کی زبان میں پوچھا تھا۔ . . . . دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے؟ لیکن حقیقتاً سرزمین قدس میں مدفون بابرکت اور فخر روزگار شخصیتیں اندازہ اور شمار سے بھی زیادہ ہیں۔

سرزمین پاک میں جوہر کے جسد اطہر کو پیوست خاک کرنے کا نقشہ کھینچا گیا ہے، مصر نے برسہا برس کے شعری جمود و تعطل کے بعد شوقی جیسا شاعر پیدا کیا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ محمد علی جوہر جیسا مخلص اور مجاہد بھی سرزمین ہند نے بڑی مشکل سے پیدا کیا تھا۔ امیر المجاہدین کی وفات پر امیر الشعراء کا مرثیہ ایک زندگی بخش نغمہ ہے جو جوہر سے محبت کرنے والوں کے دلوں میں روشنی اور حرارت پیدا کرتا ہے۔

شوقی کا مرثیہ بیت المقدس کی فضیلت سے اس طرح شروع ہوتا ہے۔[1]

بیت علی ارض الھدی وسمائہ ... الحق حائطہ واسّس بنائہ

الفتح من اعلامہ والطہر من ... اوصافہ والقدس من اسمائہ

تحضوا امناکبہ علی شعب الھدی ... وتطل سدنتہ علی سینائہ

من ذا ینازعنا مقالد بابہ ... وجلال سدتہ وطرفنائہ

ومحمد صلی علی جنباتہ ... واستقبل السمحات فی ارجائہ

ایسا گھر جو ہدایت کے زمین و آسمان پر قائم ہے جس کی عمارت اور دیواریں حق و صدق سے تعمیر ہوئی ہیں، فتح و ظفر جس کا علم ہیں، طہارت و پاکیزگی جس کے اوصاف ہیں، اور قدس جس کا نام ہے ہدایت یافتہ قوم کے لیے اس کے بازو شفیق ہیں، اور اس کے برآمدے سینا کے سمت جھانک رہے ہیں۔ کون ہے جو ہمارے مقابلے میں اسکے دروازوں کی کنجیوں اس کے برآمدوں کے جلال اور اس کے آنگن کی طہارت کا حقدار ہو؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے پہلووں میں نماز پڑھی ہے اور رحمت کی جود و سخا کا استقبال بھی اس کے گوشوں میں کیا ہے۔

شوقی نے بیت المقدس کی تعریف میں یہ چند شعر کہے ہیں، ان کی مختصر تشریح ضروری ہے۔

---

[1] دیوان شوقی مسمی "شوقیات" جلد سوم صفحہ ۱۲۔

پہلے شاعر نے ہدایت وحق کی دیواروں اور ستونوں پر اسکی تعمیر بتائی ہے، بیت المقدس کی تعمیر کے سلسلے کی تین روایتوں میں سے جس کو بھی صحیح مانا جائے یہ بات مسلم اور متحقق ہو جاتی ہے کہ وہ حق وخیر کی بنیادوں پر استوار ہوئی تھی۔ اگر یہ روایت مانی جائے کہ تعمیر بیت المقدس فرشتوں نے کی۔ تو وہ بلاریب حق وہدایت کا مظہر ثابت ہوتی ہے، اگر یہ روایت مانی جائے کہ حضرت آدمؑ کی اولاد میں سے کسی صالح شخص نے کعبہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد اس کی تعمیر کی ہے۔ تب بھی صلاح وخیر ہی کے ستونوں کے کھڑے ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور اگر صحیح ترین قول یعنی اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر مانا جائے تب بھی پیغمبر کے زیر ہدایت جو تعمیر ہوئی وہ حق وہدایت کا منبع ضرور ہوگی۔

تیسرے شعر میں سینا سے مراد جغرافیائی طور پر جزیرہ نمائے سینا یا تاریخی طور پر بائبل کی زبان میں بریہ "یا بیابان سینا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد سلسلۂ جبال سینا کی وہ پہاڑی یا وہ حصہ ہے جس پر حضرت موسیٰؑ کو تجلی ہوئی تھی۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے طور، یا جانب طور، یا طور کا دایاں حصہ۔ یا طور سینا، اور طور سینین کہا گیا ہے۔ اور تجلی خاص کے وقت اسے صرف جبل کے نام سے پکارا گیا ہے۔

تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۱۳۸ میں ہے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ فرشتوں نے بیت المقدس کو خدا کے حکم سے کعبہ کے چالیس سال کے بعد بنایا ہو، کعبہ شریف کے سلسلے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ اسے فرشتوں نے بنایا ہے، مفسر ابن جریر طبری نے جلد ۴ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ سب سے پہلی مسجد مسجد حرام ہے پھر مسجد اقصیٰ ان کی تعمیر کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہے، کعبہ شریف کے سلسلے میں قرطبی ج ۴ ص ۱۳۸ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ اسے حضرت آدمؑ نے بنایا ہے، پھر لکھا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ حضرت آدمؑ کی اولاد میں سے کسی نے چالیس سال بعد بیت المقدس بنایا۔ صحیح ترین قول سنن نسائی کی وہ حدیث ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل ہوئی ہے کہ جب سلیمان بن داؤد علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کی تو اللہ تعالیٰ سے تین چیزوں کی دعا مانگی (قرطبی ج ۴ ص ۱۳۸) بائبل کا بیان بھی نسائی کی روایت کی تصدیق کرتا ہے، اور بنی اسرائیل کے ملک مصر سے نکل آنے کے بعد ۴۸۰ ویں سال اسرائیل پر سلیمانؑ کی سلطنت کے چوتھے برس زیو کے مہینے میں جو دوسرا مہینہ ہے ایسا ہوا کہ اس نے خداوند کا گھر بنانا شروع کیا۔ (بقیہ حاشیہ ص ۳۸۵)

فلما تجلیٰ ربہ للجبل جعلہ دکاوخر موسیٰ صعقا

اور جب اسکے رب کی تجلی پہاڑ پر ہوئی تو ڈھا گیا اور موسیٰ بیہوش ہوکر گر پڑے۔

بائبل میں اس تجلی گاہ کا نام "حورب" اس طرح آیا ہے "اور موسیٰ اپنے خسر یترو کی جو مدیان کا کاہن تھا۔ بھیڑ بکریاں چراتا تھا۔ وہ بھیڑ بکریوں کو ہنکاتا ہوا ان کو بیابان کی پرلی طرف سے خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک لے آیا۔ اور خداوند کا فرشتہ ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلہ میں اس پر ظاہر ہوا۔ نیز ایلیا کو بھی ملاک الٰہی نے جبل حورب پر جانے کا حکم دیا تھا۔ چالیس دن اور چالیس رات چل کر وہ خدا کے پہاڑ حورب تک گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور خداوند کا یہ کلام اس پر نازل ہوا۔ اس پہاڑ کو کوہ سینا کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً تیسرے دن کوہ سینا پر خدا کے ظاہر ہونے کا وعدہ تھا۔ اور لوگ منتظر تھے کہ کوہ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا۔ کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا۔ اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا۔ اور سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا۔ حورب کی چٹان ہی پر حضرت موسیٰؑ نے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۴) ا۔ سلاطین ۶۔۱) یہاں ایک اشکال یہ پیش آتا ہے کہ خانہ کعبہ اور بیت المقدس میں چالیس سال کا وقفہ جو بیان ہوا ہے اگر وہ روایت صحیح ہو تو اسکا حل کیا ہے؟ قرطبی نے یہ حل پیش کیا ہے حضرت ابراہیمؑ و سلیمانؑ، دونوں نے کسی ایسی عمارت کی تجدید کی ہو جو ان سے قبل بنائی گئی ہو، چاہے فرشتوں نے بنایا ہو یا آدمؑ نے یا اولاد آدمؑ نے۔ قصص ۲۹ طور کے لفظ کے متعلق لسان العرب میں ہے کہ کلام عرب میں اسکے لغوی معنی پہاڑ کے ہیں، اور طور سینا سے وہ پہاڑ مراد ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے کلام کیا، قرطبی میں بھی واضح قول یہی ہے کہ جس پر تجلی ہوئی اور تورات عطا ہوئی، ایک قول مجاہد کا یہ بھی ہے کہ یہ سریانی لفظ ہے جو ہر پہاڑ کے لیے بولا جاتا ہے، قصص ۴۶ مریم ۵۲ مومنون ۲۰ تین ۲ اعراف ۱۴۳ خروج ۳۔۱ و ۲ ا سلاطین ۱۹۔۸ و ۹، قرآن کی زبان میں حضرت الیاسؑ خروج ۱۹۔۱۸

لاٹھی مار کر پانی نکالا تھا۔[1]

موجودہ جغرافیائی حیثیت سے یہ تجلی کہاں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ کوہ سربال پر دوسرا یہ کہ کوہ موسیٰ پر، دوسرا قول اپنے نام کے اعتبار سے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ کوہ موسیٰ حالیہ بستی یا شہر طور کے جنوب مغرب میں واقع ہے، بہرحال اتنی بات تو قطعاً صحیح ہے کہ پہاڑی سلسلے میں سے کسی پر تجلی ہوئی تھی، جس کا نام طور یا حورب کہا جا سکتا ہے، اور تجلی کی وجہ سے وہ ضرب المثل بن گیا ہے، بیت المقدس اس تجلی گاہ کے سامنے واقع ہے، اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے شاعر نے شاعرانہ لیکن حقیقت سے قریب تر تشبیہات کا استعمال کیا ہے،

یہ ذہن میں رہے کہ مرثیہ ۱۹۳۱ء میں کہا گیا ہے۔ اور فلسطین کا مسئلہ اُس وقت بھی بین الاقوامی سیاست کا محور بنا ہوا تھا، شوقی نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے حقدار اس میں بسنے والے پاکباز مومن ہیں جو پاکیزگی وعفاف اور حق وصداقت کے متوالے اور نبی امیؐ کے شیدائی ہیں، شاعر نے یہ حقیقت چوتھے شعر میں بیان کی ہے۔ یہ ایک سیاسی موضوع بھی تھا، لیکن شاعر کی شاعرانہ صلاحیت یہ ہے کہ وہ سیاسی، فلسفیانہ اور اجتماعی وانسانی زندگی سے متعلق موضوعات پر جب قلم اٹھاتا ہے، تو سیاسی، فلسفی، ناقد اور مبصر بن کر نہیں بلکہ صرف شاعر ہوتا ہے، اور شاعرانہ زبان میں جذبات انسانی کی ترجمانی کے لیے ایسا اسلوب اختیار کرتا ہے کہ اس کی زبان سے نکلی ہوئی بات دل میں سما جاتی ہے

غرض جس مقدس پہاڑ پر تجلی ہوئی تھی قدس اسکے سامنے ہے، اور خاتم النبیین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سرزمین مقدس میں لیلۃ المعراج میں نماز پڑھی تھی۔[2] اسلیے اس زمین

[1] خروج ۱۷، ۱-۷ [2] اسکی تفصیل بخاری باب کیف فرضت الصلاۃ حدیث نمبر ایک میں دیکھی جاسکتی ہے۔

کی رفعت اور عروج پر اگر افلاک کو بھی رشک آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

آگے چل کر شوقی کہتے ہیں۔

والیوم ضم الناس مأتم ارضہ — وحوی الملائک مهرجان سمائه

یا قدس ھیئی من ریاضک ربوۃ — لنزیل تربک واحتفل بلقائه

آج اس سرزمین پر ماتم کے لیے لوگ جمع ہیں۔ اور آسمان پر فرشتوں کا مجمع ہے۔ اے قدس اپنے چمن میں ایک آشیانہ کا انتظام کر لے اور اپنی مٹی میں دفن ہونے والے کے لیے استقبال کی تیاریاں کر۔

اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر کی بعض خصوصی صفات کو شاعر اس طرح بیان کرتا ہے۔

ھو من سیوف اللہ جل جلاله — او من سیوف الھند عند تضائه

بطل حقوق الشرق من اعمالہ — وقضیۃ الاسلام من اعبائه

لم تنسه الهند العزیزۃ قدہ — للشرق او سهدا علی اشیائه

وقباؤہ نسج الهنود فهل تری — دفنوا الزعیم مکفنا بقبائه

وہ اللہ جل جلالہ کی تلواروں میں سے ایک تھے۔ یا شمشیر ہندی کی طرح تھے، وار کرتے وقت وہ ایسے ہیرو تھے کہ مشرق کے حقوق تسلیم کرانا ان کا عمل تھا، اور اسلامی کاز کے لیے کوشش کرنا ان کا مقصد تھا۔ محبوب سرزمین ہند انکی تڑپ کو نہیں بھول سکتی اور نہ مشرق کے لیے ان کی بے خوابی کو، ان کی قبا ہندستانی ہاتھوں نے بنائی تھی، تمہاری کیا رائے ہے، کیا لیڈر کو اس کی قبا ہی میں دفن بھی کیا گیا ہے۔؟

سیف اللہ حضرت خالد بن ولیدؓ کا لقب ہے، حضور رسالتؐ نے آپ کو یہ معزز لقب عطا کیا تھا۔ ہندی تلوار اس کی دھار سیف ہندی یا سیف ہند وغیرہ کی تعبیر ایک جانی پہچانی ترکیب ہے، ہندوستان کے اسلامی مجاہد کی شمشیر ہند سے تشبیہ میں عربی شاعری کے قدیم معنی میں ایک جدید روح پیدا ہوگئی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ

شاعر نے شمشیر خدا کہکر جوہر کی شجاعت، اسلامی حمیت اور حضرت خالد بن ولیدؓ کا جذب وشوق شہادت واضح کیا ہے، اور شمشیر ہند کہکر قدیم ہندوستانی تلواروں کی صفات صیقل اور دھار کی تعریف سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جوہر دو آتشہ تھے، ایک طرف راسخ العقیدہ مرد مومن تھے ان کا دل مذہبی جذبات سے معمور تھا۔ اور مذہبی امور میں کسی مداہنت کے قائل نہ تھے، جس کو بعض تنگ نظروں نے فرقہ پروری سے تعبیر کیا ہے، لیکن دوسری طرف سچے قوم پرور اور وطن دوست تھے، اور ان کی پوری زندگی ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد اور انگریزوں سے ٹکر لینے میں گذری، اور اسی پر انکا خاتمہ ہوا چنانچہ راونڈ ٹیبل کانفرنس میں انکی آخری تاریخی تقریر شاہد ہے۔

شاعر انکے غم میں انسو بہانے والوں کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے۔

النیل یذکر فی الحوادث صوتہ ۔۔۔ والترک لاینسون صدق بلائہ

قل للزعیم محمد نزل الاسی ۔۔۔ بالنیل واستولی علی بطحائہ

فمشی الیک بجفنہ ودمائہ ۔۔۔ والی اخیک بقلبہ وعنائہ

ولقد تعود ان تمر بارضہ ۔۔۔ مدرا لغمام بظلہ وبمائہ

نیل مصیبتوں کے وقت اس کی آواز کو یاد کرتا ہے اور ترک اس کے مخلصانہ جہاد کو نہیں بھول سکتے، زعیم محمد سے کہدو غم کی بارش ہوگئی، اور سرزمین نیل پر غم کے بادل چھاگئے۔ اس لیے نیل پلک اور آنسو بن کر تم کو روتی ہے اور جان و دل سے تمہارے بھائی کی تعزیت کرتی ہے، اور تمہاری تو یہ عادت تھی کہ سرزمین نیل سے ایسا بادل بن کر گذرتے تھے جس میں سایہ بھی ہو اور سیرابی بھی۔

مخلص ترک اس مالی وجانی امداد اور کوششوں کو نہیں ... بھول سکتے جو

برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزی سامراج کے علی الرغم بلقان وغیرہ کی جنگوں کے موقع پر مولانا جوہر کی قیادت میں کی تھیں۔ جسکی طرف شوقی نے ایک مصرعہ ہی میں اشارہ کیا ہے، نیل مصر کا حیات بخش دریا ہے، نیل سے مراد یہاں سرزمین مصر ہے۔ بھائی سے مراد مولانا شوکت علی مرحوم ہیں، علی برادران کی شہرت مصر میں کافی تھی خلافت کیطرح مولانا مصر کی آزادی کے بھی متمنی تھے اور بارہا مصر آئے تھے، شاعر نے انکی آمد کو ایسے بادل سے تشبیہہ دی ہے جو امید وں اور ارمانوں کا پیام تشنہ لبوں کیلئے لاتا ہو، شاعر اپنا مرثیہ اس انداز پر ختم کرتا ہے۔

نم فی جوار اللہ ما بک غربۃ ۔۔۔ فی ظل بیت انت من ابنائہ

الفتح وھو قضیۃ تحمد سیفہ ۔۔۔ یاطالما ناضلت دون لوائہ

افتنی بد فنک عند سیدۃ القری ۔۔۔ مفت اراد اللہ من افتائہ

بلد بنوہ الاکرمون قصورھم ۔۔۔ وقبورھم وقف علی نزلائہ

قد عشت تنصرہ وتمنح اھلہ ۔۔۔ عونا فکیف تکون من غربائہ

اللہ کے پڑوس میں سوجاؤ تمھیں مسافرت کی اجنبیت نہیں، ایسے وطن میں سو جس کی تم اولاد ہو، قدس کے قضیہ میں تم فتح وظفر کے طالب تھے، اس پرچم کے سایہ میں کتنے بار لڑے تھے دستیوں کی سرداری قدس کی زمین میں دفن ہونے کا فتوی ایک مفتی نے دیا، خدا کی مشیت میں جس کے لیے یہ سعادت لکھی تھی، یہ ایسا شہر ہے جس کی محترم ہستیوں کے محلات اور ان کے مقبرے آئے ہوئے مہمانوں کے لیے وقف ہیں۔ تم اپنی پوری زندگی اس سرزمین کی امداد اور اس کے عوام کی خدمت میں صرف کرتے رہے، اس لیے تم اجنبی کیسے ہو سکتے ہو۔

قدس میں دفن ہونے کے لیے مفتی اسلام کی اجازت یا فتوی کی ضرورت ہوتی تھی جسکی پیشکش خود مفتی فلسطین نے کی تھی، اسلیئے اسلام کا یہ مجاہد اس مقدس سرزمین میں دفن کردیا گیا جسکے لیے بابرکت ہونے کا مژدہ خود قرآن نے سنایا ہے۔ بیت المقدس کی سرزمین مجد و قدس میں سونے والے ہندوستانی مجاہد و مسافر تجھے سلامتی و رحمت کے جھونکے تاقیامت فیض یاب کرتے رہیں، آمین

ادبیات

مسجد قرطبہ کی واپسی

از جناب سید غلام سمنانی جونپوری

(۱)

ہے نگہ اشتیاق، محو تماشائے ذات
توڑ دیئے عشق نے عقل کے لات و منات

عشق ہے فتح مبین، عشق ہی نور یقین
عشق عمید و متین، عشق ہی صبر و ثبات

عشق کا سوز نفس، گرمیٔ بازار شوق
عشق کا اشک رواں، دجلہ و نیل و فرات

کون و مکین ہیں بندۂ بے دام عشق
عشق رئیس الکرام، عشق امیر التفات

عشق ہے مہر منیر، عشق سے روشن ہوئی
تیرہ و تاریک تھی، انجمن کائنات

جنبش ابروئے عشق، جنبش بال قضا
فتنۂ یوم نشور، عشق کی ادنیٰ سی بات

مٹ گئی اک آن میں کشمکش جسم و جان
اُٹھ گیا اک آن میں پردۂ ذات و صفات

وسعت دشت طلب، عشق کو فردوس جاں
نیش غم جاوداں، عشق کو شاخ نبات

مرحلۂ عشق میں خار الم گل بدوش
میکدۂ عشق میں زہر ہے آب حیات

عشق کی تقدیر ہو آتش و خون و زہر و گیر
عشق کو پیش آئے ہیں ایسے بہت سانحات

عزم و عمل کیلئے کچھ نہیں ارض و سما
عزم و عمل کیلئے کچھ نہیں یہ شش جہات

زیر قدم آگیا خیمۂ عرش بریں
ہو گئی ہے ریزہ ریزہ، شیشہ گہ ممکنات

میرے جنون کا صلہ مملکت تخت و فوق
عقل نے پایا کوش ہی میرے جنون کی زکات

مجھ پہ ہوئے منکشف لوح و قلم کے رموز
پوچھ لے مجھ سے کوئی راز حیات و ممات

شاطر تقدیر نے چال کچھ ایسی چلی
دیکھتے ہی دیکھتے کھا گئی تدبیر مات

کتنے دنوں پر ملا عشق کو اذن سجود
پھر وہی جوش اذاں پھر وہی لطف صلوٰۃ

چشم تمنا میں ہے حسن سراپائے دوست
سامعہ افروز ہے لذت آوائے دوست

(۲)

قافلۂ وقت ہے، گرم رو و تیز گام
کس کیلئے ہے قعود، کس کیلئے ہو قیام

کم ترک از برگ خشک، کم ترک از ریگ دشت
وقت کے صحرا میں یہ شام و سحر کے خیام

وقت کے دریا کی موج جوشش طوفاں بدوش
وقت کا ساحل نہیں اسکا نہیں ہے مقام

وقت کے تیشہ سے آب نیزۂ فولاد و سنگ
کوشک و ایوان و کاخ، قصر و در و سقف و بام

وقت کی تیغ اصیل، وقت کی شمشیر تیز
بے جگر و بے خطر، بے خبر و بے نیام

وقت کے محکوم ہیں قیصر و خاقان و میر
خواجہ و شاہ و سپاہ وقت کے ادنیٰ غلام

وقت سکون ناشناس، وقت ہو شورش اساس
وقت کا رہوار ہے تند رو و بے زمام

مرغ بلند آشیاں، اس کا اسیر قفس
وقت کا صیاد ہے، تیز نگہ تنگ دام

وقت کے معبد میں سب مجو رکوع و سجود
وقت کے سب مقتدی، وقت ہو سب کا امام

کس کو ملی ہے یہاں رخصت اظہار شوق
کس کو ملی ہے یہاں فرصت عیش دوام

خواب پریشاں سے کم آرزوئے دل نہیں
خواہش عیش دوام، ایک تمنائے خام

وقت کی اک آن میں ماضی و فردا و حال
وقت کی اک شان ہو انجمن صبح و شام

وقت عظیم و جلیل، وقت محیط و بسیط
وقت کو کچھ مت کہو، یہ ہے کسی کا پیام

وقت ہے درمان درد، وقت دم گرم مرد
وقت ہی خود زخم ہے، وقت ہی خود التیام

وقت نہیں بے حدود، وقت نہیں بے ثبوت
اسکی بھی ہے انتہا، اس کا بھی ہے اختتام

وقت ہے سیل رواں، عشق ہے کوہ گراں
وقت کے اس سیل کو عشق ہی لیتا ہے تھام

عشق ازل آشنا، عشق ابد اختیار
عشق ہے دار البقا، عشق ہے دار القرار

(۳)

اب نگہ شوق میں غیب ہے عین شہود
راز کہاں رہ گیا، عالم بود و نبود

شاہد تقدیر نے رخ سے الٹ دی نقاب
پھر وہی ذکر جمیل، پھر وہی گفت و شنود

عشق پہ تیری بنا، عشق سے تیرا خمیر
ہے یہی راز دوام، ہے یہی راز خلود

نقش ترا لازوال، نقش ترا بے مثال
کام تو کچھ کر گیا، عشق کا ذوق نمود

جس کے تھے قلب و نظر جلوہ شناس ازل
تھا وہ یقیناً ترا نقش طراز وجود

جس کے ہنر نے کئے جمع بحسن و کمال
کسوت تہذیب کے بکھرے ہوئے تار و پود

جس کو بہا لے گیا ساحل مقصود تک
لطمۂ بحر عطا، موجۂ دریائے جود

جسکی امیری سے تھا حسن فقیری عیاں
جسکی نگاہوں میں ہیچ، خوبی یان شوق سود

راز کے بند قبا کھل گئے اک آن میں
عقدۂ مشکل کی تھی جس سے کشاد و کشود

اسکی نگہ دل کشا، اس کی ادا حق نما
کتنے ہی فتنے اٹھے زیر سپہر کبود

بزم گہ ناز میں جلوہ فروز کرم
رزم گہ کار میں ہوش ربائے جنود

زورق و طوفاں شکن، ہر دو زن و جاں شکن
قیصر و خاقاں شکن، اسکا قدوم درود

جس کا خیال و عمل، باعث تجدید شوق
جس سے کہ توڑا گیا مغربیوں کا جمود

خلوت و جلوت میں تھا نقش گر صد یقین
اسکا قیام و قعود اسکا رکوع و سجود

اسکا ہیں عطا، شاہد تہذیب نو
اسکی رہین کرم، کارگہ دیر و زود

کتنے دنوں تک رہا ساز نوا بے خروش
کتنے دنوں تک رہی محفل جاں بے سرود

اک نئے عنوان سے جشن بہاراں ہوا
جشن بہاراں ہوا، رقص نگاراں ہوا

(۴)

تیرے ہر اک سنگ میں نور دل جبرئیل
تو ہے عدیم النظیر، تو ہے عدیم المثیل

تیری ہر اک خشت میں خون رگ دلبری
تیرا ہر اک پیچ و خم، رقص گہ سلسبیل

منبر و محراب و در، یہ ترے نقش و نگار
مصدر خیر کثیر، مرکز اجر جزیل

تیری بلندی سے پست ہفت چرخ بریں
تجھ سے ہوا فرش خاک کتنا عظیم و جلیل

جن کی بہاروں سے فاش راز بہار ارم
تیرے وہ گلزار و باغ، تیری وہ کشت نخیل

حکمت تعمیر کو تجھ سے ملی آب و تاب
حکمت تعمیر کا تیری نہیں ہے عدیل

وسمۂ ابروئے نیست ہے تیرا دود چراغ
تیری رہ خاک سے دیدۂ مغرب کحیل

شمع رہ دیں بنی ظلمت مغرب میں تو
علم و ہنر کے لئے تیری بنا سنگ میل

مجھکو ہے معلوم [illegible] وہ آذر ترا
آہ وہ فرد فرید، آہ وہ مرد نبیل

مرحلۂ حق میں تھا صبر و رضا کا نقیب
جس سے ہوا آشکار سر ذبیح و خلیل

اسکا عمل، اسکا عزم، اسکا ستم، اسکا حزم
چشم جہاں کے لئے ایک کتاب الدلیل

جس کی زرہ لا الٰہ، جسکی سپر لا اللہ
جسکے لئے کچھ نہیں تیغ و سناں اسپ و فیل

عرصۂ پیکار میں، قلزم ذخار میں
کچھ نہ رہا کیفیت و کم، کچھ نہ رہا قال و قیل

بن گیا مضراب جاں، بن گیا مہمیز شوق
اسکے قلیم کا صریر، اسکے فرس کا صہیل

بندۂ مومن کی روح تجھ سے ہے پرتو فشاں
وہ بھی نہیں مستحیل، تو بھی نہیں مستحیل

پھر ہے وہی رستخیز، پھر وہی شور ستیز
تازہ نہ ہو جائے پھر قصۂ فرعون و نیل

ضرب کلیمی بھی ہے اور ید بیضا بھی ہے
ساحر عصر جدید! تو نے یہ دیکھا بھی ہے

مطبوعات جدیدہ

نذر عابد، مرتبہ جناب مالک رام صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۴۲ مجلد مع گرد پوش قیمت عہ روپے (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دلی، نئی دلی، بمبئی، علی گڈھ (۲) علمی مجلس (۳) چھتہ نواب صاحب فراشخانہ دلی نمبر ۶

نذر ذاکر و نذر عرشی کے بعد جناب مالک رام صاحب نے بزرگ صاحب علم و قلم ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی خدمات و کمالات کے اعتراف کے لئے یہ کتاب شائع کی ہے، اس میں پہلے دو تذکرہ کے زیر عنوان چار مضامین ہیں، عابد صاحب کی سیرت شخصیت اور حالات و کمالات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، عابد صاحب کی بیگم صالحہ نے ان کی گھریلو زندگی، روزمرہ کے واقعات اور عادات و خصائل کی بڑی بیساختگی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے، یہ مضمون نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہے، فاضل مرتب نے ڈاکٹر صاحب کے خاندان اور تعلیم کے حالات اور تدریسی و تصنیفی کارنامے تحریر کئے ہیں، اور جمیل الدین قریشی نے ان کے مضامین و تصنیفات کا اشاریہ مرتب کیا ہے اس حصہ میں ڈاکٹر صاحب کے عزیز غلام السیدین مرحوم کا ایک قابل قدر مقالہ بھی ہے، دوسرا حصہ مشاہیر علم و ادب کے بلند پایہ محققانہ مضامین پر مشتمل ہے، سرراس مسعود کی سیرت و شخصیت پر پروفیسر ہارون خاں شروانی اور شری شنکر اچاریہ کے فلسفہ ویدانت کی تشریح پر پروفیسر سلیم چشتی کے مضامین قابل مطالعہ ہیں، اس مجموعہ کے زیادہ اہم طویل مضامین دو ہیں، (۱) قاطع برہان کا پہلا مسودہ (مولانا امتیاز علی

خان عرشی) اور (۲) اقبال کا تصور زمان (شبیر احمد خاں غوری) پہلے میں برہان قاطع کے حاشیہ پر غالب نے قاطع برہان کے نام سے اس کا جو رد لکھا تھا اس پر نظر خیال کرکے اس کی تائید یا تردید کی گئی ہے، دوسرے میں زمانہ کے متعلق ڈاکٹر اقبال کے خیالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، کہ وہ تا مہ زمان کے قائل تھے، گو بظاہر اس بارہ میں ڈاکٹر صاحب کے بعض خیالات محل نظر اور غیر معتدل معلوم ہوتے ہوں، لیکن مقالہ نگار نے بھی زود حسی اور بعض شاعرانہ خیال آرائیوں کی تعبیر میں شدت پسندی سے کام لیا ہے، لیکن مضمون کاوش اور دیدہ ریزی سے لکھا گیا ہے، ضیاء الحسن صاحب فاروقی نے ترکی کے ابراہیم شناسی کے افکار پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ مولانا شبلی پر ماضی کی خوابناک فضاؤں میں گم ہو جانے، حال کو نظر انداز کر دینے اور مستقبل کی تعمیر سے غفلت برتنے کا طعنہ کیا ہے، حالانکہ اس زمانہ کے علماء میں مولانا شبلی زمانہ سے واقفیت اور باخبری کے لئے ممتاز تھے، اور انھوں نے حال و مستقبل کی صحیح بنیادوں پر تعمیر ہی کیلئے ماضی کے سبق آموز واقعات مسلمانوں کو یاد دلائے تھے،

اس واسطے چھیڑا ہے پرانوں کا فسانہ — شاید ترے کانوں تک پیام عمل جائے

ڈاکٹر سید عابد حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اولین خدمت گذاروں اور بنیادی معماروں میں ہیں، اور اس کے کاموں میں وہ ڈاکٹر ذاکر مرحوم اور پروفیسر مجیب کے دست راست رہ چکے ہیں، ان کا اصل ذوق درس و تدریس اور تصنیف و تالیف ہے اور وہ اردو کے صاحب طرز ادیب ہیں، اور ان کی تصنیفی خدمات ان کی تعلیمی خدمات سے زیادہ اہم ہیں، اس لئے ان کے کمالات کا اعتراف بجا بھی ہے، اور قابل تحسین بھی، اس کیلئے مالک رام صاحب اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں،

اکابر تعلیم:- از جناب سید انصاری صاحب متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۲۴، قیمت ۳/۵۰ پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

مصنف کی پوری زندگی تعلیمی خدمات میں گذری اور تعلیم اور اس کی تاریخ ان کا خاص موضوع ہے، اور وہ اس پر وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھتے رہے ہیں، زیر نظر کتاب میں انھوں نے دس ایسے مشاہیر کے تعلیمی افکار و نظریات کا خلاصہ تحریر کیا ہے، جنھوں نے جدید تعلیم کے متعلق خیالات ظاہر کئے ہیں اور اس کے عملی پہلوؤں پر بحث کی ہے، ان میں افلاطون، روسو، پستالوزی اور جان ڈوئی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، ہندوستان کے مشاہیر میں ٹیگور اور گاندھی جی کے نام ہیں، لائق مصنف نے ان کے تعلیمی تصورات کے ساتھ ان کا مختصر تذکرہ بھی کیا ہے لیکن جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ یہ مواد تدریس کی غرض سے اکٹھا کیا گیا تھا اس لیے اس میں بڑا اختصار ہے، اور کہیں کہیں تشنگی محسوس ہوتی ہے، اردو داں طبقہ گاندھی جی اور ٹیگور کے حالات سے تو واقف ہے، لیکن غیر ہندوستانی مشاہیر تعلیم کے حالات سے اسکو کم واقفیت ہے، اسلئے انکے حالات قدرے اور تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی، یہ کتاب مصنف کے تعلیمی تجربے، وسیع مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہے، اسلئے بہت مفید اور خصوصاً مدرسین کے مطالعہ کے لائق ہے،

صحیفۂ جمال:- از پروفیسر عبد السمیع خاں نکہت، تقطیع متوسط کاغذ کتابت طباعت قدرے بہتر صفحات ۲۸۴ قیمت ۳/- پتہ:- نکہت منزل محلہ بہادر گنج شاہجہاں پور۔ یو۔ پی۔

پروفیسر عبد السمیع خانصاحب نکہت شاہجہاں پوری کہنہ مشق شاعر بھی ہیں اور صاحب علم و قلم بھی، نظم و نثر میں ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں، ان کتابوں میں مذہبی اور صوفیانہ مسائل اور متکلمانہ و فلسفیانہ مباحث کی تشریح کی گئی ہے،

زیر نظر کتاب نکہت صاحب کی تازہ تصنیف ہے، جو تین حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ صحیفۂ جمال میں دینی اور اخلاقی اور صوفیانہ حقایق سے متعلق آیات اور ان کے منظوم ترجمے پیش کئے گئے ہیں، دوسرے حصہ صحیفۂ کمال میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے فضائل و اثرات، تجلیات و صفات ربانیہ کی دلکش تفسیر اور ۹۹ ناموں کی خصوصیات ان کے روزمرہ ورد کے فوائد اور روحانی برکات بیان کئے گئے ہیں، تیسرے حصہ صاعقۂ جمال میں مذہب و تصوف اور کلام و عقائد کے مسائل کا ذکر اور موجودہ دور کے فاسد رجحانات اور بے راہ روی پر تنقید کی گئی ہے، اس طرح تینوں حصے اسم با مسمیٰ ہیں، پہلا اور تیسرا حصہ منظوم اور دوسرا نثر میں ہے، لیکن تیسرے حصہ کے حواشی میں بعض کلامی مباحث کی تشریح نثر میں کی گئی ہے، اور دوسرے میں اللہ تعالیٰ کے مبارک ناموں کی تشریح میں ان کے مناسب مصنف کی ایک رباعی بھی ہے، آیتوں کی نقل اور تصحیح میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے، اس لئے بعض آیتیں غلط نقل ہو گئی ہیں، ص۱۲ پر خیر و شر کے زیر عنوان واللہ خالق الظلمات والنور درج ہے، حالانکہ یہ کوئی آیت نہیں، کہیں کہیں تحریر کے الجھاؤ سے قطع نظر، نظم و نثر کا یہ گلدستہ مختلف النوع دینی معلومات کے لحاظ سے قابل قدر ہے،

تاریخ نور:- مرتبہ جناب کلیم الدین احمد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ و کتابت، طباعت بہتر صفحات ۸۰، قیمت ۲/- پتہ:- ڈاکٹر محمد یوسف خورشیدی، پتھر کی مسجد پٹنہ نمبر ۴،

یہ نواب نور زماں بیگم کے نام واجد علی شاہ کے ۳۸ خطوط کا مجموعہ ہے، ان میں ۳۶ خطوط نظر بندی کے زمانہ کے اور دو رہائی کے بعد کے ہیں، تاریخ نور کا ایک قلمی نسخہ جناب کلیم الدین احمد صاحب کو ڈیڑھ سے ملا تھا جس کو انھوں نے ایک مختصر مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، ابتدا میں حمد و نعت کے چند

اشعار اور کتاب کی تالیف کے آغاز کے متعلق نواب نور زماں بیگم کی ایک مختصر تحریر ہے، اور خاتمہ بھی بیگم صاحبہ ہی کی تحریر، اور ان کے کاتب محمد حسن لکھنوی کی مختصر تحریر اور بدیعہ اشعار پر ہوا ہے، یہ خطوط چونکہ بادشاہ نے اپنی محبوبہ کو لکھے تھے، اس لئے ان میں بڑی رنگینی اور شوخی ہے، مقدمہ میں مخطوطہ کے متعلق مختصر اظہار خیال کے بعد واجد علی شاہ کے بارہ میں بعض تذکرہ نگاروں اور مورخین کے دلچسپ بیانات نقل کئے گئے ہیں، تاریخ نور واجد علی شاہ کی نظم نثر دونوں کا نمونہ اور ایک ادبی تبرک اور دستاویز ہے،

خوان خلیل، از حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۰، قیمت ۱۲؎ پتہ ناظم کتبخانہ یحیوی مظاہر العلوم، سہارن پور،

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے افادات میں یہ مختصر رسالہ بھی ہے جو نامور محدث مولانا خلیل احمد سہارن پوری صاحب بذل المجہود کی وفات کے بعد ان کے بعض سبق آموز واقعات و حالات بیان کرنے کے لئے تحریر کیا گیا تھا، مگر اس میں ضمناً دوسرے مفید علمی و فقہی نکات و مسائل بھی قلمبند کئے گئے ہیں اب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری نے اس کو تلاش کرا کے شائع کیا ہے، اور اس کے آخر میں مفید ضمیموں اور جا بجا حواشی کا اضافہ کر دیا ہے، ان میں تشریح طلب امور کی وضاحت، حوالوں کا اندراج اور دوسری ضروری اور مفید باتوں کو ضبط کیا گیا ہے، اس لئے یہ رسالہ مزید بیش قیمت ہو گیا ہے، حضرت سہارنپوری کے حالات، حکیم الامت کے افادات اور شیخ الحدیث کے ضمیمے نور علی نور اور قدر دانوں کی پذیرائی کے لائق ہیں،

قرآن اور پردہ، از مولانا امین احسن اصلاحی، تقطیع خورد، کاغذ و طباعت عمدہ ٹائپ، صفحات ۲۳، قیمت ۶۰ پیسے، پتہ دار الاشاعت الاسلامیہ، لاہور، کوثر روڈ، اسلام پورہ ۲،

اس مختصر کتابچہ میں پردہ کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں پردہ سے متعلق قرآنی آیات کی تشریح کے علاوہ ان کے موقع اور محل کی تعیین کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ پردہ کے احکام دو طرح کے ہیں ایک تو گھر کے اندر کے لئے جن کی صراحت سورہ نور میں کی گئی ہے، دوسرے گھر کے باہر کے لئے جن کا ذکر سورہ احزاب میں ہے، اس فرق کو عموماً پردہ کے حامیوں نے نظر انداز کر دیا ہے اس لئے ان کی تحریروں میں تضاد اور استدلال میں خامیاں پائی جاتی ہیں، اس حیثیت سے یہ رسالہ ان کے لئے بھی بڑا مفید ہے، اور اس سے پردہ کے مخالفوں کے شبہات و اعتراضات کا مکمل ازالہ بھی ہو جاتا ہے،

عظمت قرآن، تالیف جناب قاری عبد الحئی صاحب، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۴، قیمت ۵۰ پیسے، پتہ جامع مسجد صدیقی بس اسٹاپ اڈہ کورنگی کالونی، کراچی ۳۱

اس رسالہ میں قرآن مجید کی عظمت، تلاوت اور تعلیم کی فضیلت، ثواب اور آداب وغیرہ سے متعلق مفید اور ضروری باتیں تحریر کی گئی ہیں، اور ختم قرآن، تلاوت کی دعائیں، قرآن کے سجدے، موزوں اوقات نیز حاشیہ پر درج مختلف النوع اشارات وغیرہ کی توضیح کی گئی ہے، اور معلم قرآن کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، آخر میں قرأت سبعہ متواترہ سے متعلق ایک استفتا کا جواب بھی نقل کیا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرأت سبعہ متواترہ کا حصول فرض علی الکفایہ ہے،

سخن در سخن :- از جناب نواب مظفر الدین خان صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۱۴ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت للعہ پتہ :- ملا اکیڈمی "عزیز باغ" سلطان پورہ حیدر آباد ۲۴

یہ حیدر آباد کے نواب مظفر الدین خان صاحب کی رباعیات و قطعات کا مجموعہ ہے، وہ ۶۰ برس سے مشق سخن فرماتے ہیں لیکن ابھی انکا پہلا مجموعہ کلام شائع ہوا ہے، رباعی کے اوزان و بحور متعین ہونے کی وجہ سے وہ مشکل صنف سخن ہے اسلئے ماہر فن اور قادر الکلام شعرا ہی اس میں طبع آزمائی کرتے ہیں حیدرآباد کے بعض شعرا نے اسکی جانب خاص اعتنا کیا ہے ان میں امجد حیدر آبادی اردو کے ممتاز ترین رباعی گو تھے، انکے معنوی فیض و اثر نے صاحب کتاب کو بھی اسکی جانب مائل کر دیا، اور انھوں نے عشقیہ اخلاقی اور حزنیہ ہر طرح کی رباعیات کہی ہیں، رباعیات کی طرح قطعات کے موضوع میں بھی تنوع ہے اور وہ عاشقانہ فلسفیانہ اور اخلاقی ہر قسم کے مضامین پر مشتمل ہیں رباعیات و قطعات دونوں میں روانی و بے ساختگی اور طرز ادا کی جدت و خوبی بھی ہے مزید مشق و ممارست سے انکے رنگ میں زیادہ پختگی اور نکھار پیدا ہو گا۔

آریہ سماج کی ترقیاں حصہ اول و دوم :- مترجم جناب فدا حسین صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۱۰۴ و ۲۴۶ قیمت :- عہ و سے پتہ کٹرہ شہاب خان، اٹاوہ۔ یو۔ پی

ہندوؤں کی مشہور تنظیم آریہ سماج گذشتہ پون صدی سے زیادہ عرصہ سے اپنے مشن میں سرگرم ہے اس کتاب میں انکے مشہور ہندی آرگن آریہ مستر اور دوسری کتابوں اور اخبارات کی مدد سے انکی پچھتر سالہ کارگزاریوں اور مختلف النوع کاموں کا جائزہ لیکر مختلف شعبوں اور دائروں میں انکی ترقیاں دکھائی گئی ہیں، پہلے حصہ میں آریہ پرتی ندہی سبھا اتر پردیش کا مختصر تعارف و تاریخ ۱۹۶۳ء میں آریہ سماج کی ڈائمنڈ جوبلی کے پیغامات اور تجویزیں وغیرہ نقل کی گئی ہیں پھر انکے اخبار صوبائی کانفرنس، بعض تقریبات مذہبی، سماجی، علمی اور تعلیمی خدمات اتر پردیش کے آریہ سماجی اسکولوں اور کالجوں اور بعض مشہور مذہبی و سیاسی رہنماؤں اور ضلع وار ترقیوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں تبلیغی اداروں، ملک و بیرون ملک میں تبلیغی جد و جہد ہندی کے تحفظ اور ہندوؤں میں مذہبی بیداری پیدا کرنے اور شدھی وغیرہ کے سلسلہ میں گوناگوں خدمات کا ذکر ہے اس سلسلہ میں مختلف سیاسی و مذہبی رہنماؤں کے حمایتی بیانات اور آریہ سماجیوں کی مسلمانوں اور عیسائیوں سے رد و کد کا ذکر ہے، لائق مترجم نے آریہ سماج کی سرگرمیوں اور ترقیوں سے اردو داں طبقہ خصوصاً مسلمانوں کو واقف کرانے کیلئے یہ کتاب لکھی ہے تاکہ وہ ان پر غور و فکر کرکے اپنے متعلق انکے طرز عمل سے آگاہ ہوں۔

"ض"

جلد ۱۱۴ عدد ۶

ماہ ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۴ء

مضامین